ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

دینی حکمت کا تقاضا

''ہم مسلمانوں کو اس حقیقت کو اب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر سو فیصد مسلمان تہجد گزار ہو جائیں اور ہر مسلمان کے ہاتھ میں تسبیح آجائے اور ہر مسلمان اشراق اور چاشت کا پابند ہو جائے، لیکن اگر اکثریت اس سے نامانوس ہے، اکثریت اپنے دل میں اس کی طرف سے زہر لیے بیٹھی ہے، اور سینہ میں انگارے سلگ رہے ہیں تو خدانخواستہ جس وقت اس ملک میں کوئی بھونچال آئے گا تو ہم اپنی تمام عبادتوں، نوافل کے ساتھ بے دخل ہو جائیں گے، اس وقت نوافل تو نوافل جو بنیادی چیزیں ہیں وہ بھی نہیں رہیں گی، اس لیے دینی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس آبادی کو اپنے سے مانوس بنائیں، اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچائیں، ان کو بتلائیں کہ اسلام کیا ہے؟'' (خطبات علی میاں: ۴۰/۲۰۲)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

SEP 19

₹10/-

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي

دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

(اصلاحی خطبات)

حرمت والا مہینہ

جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ

''قرآن کریم نے جہاں حرمت والے مہینوں کا ذکر فرمایا ہے، اس جگہ ایک عجیب جملہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''ان حرمت والے مہینوں میں تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔'' ظلم نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان مہینوں میں گناہ سے بچو، بدعات اور منکرات سے بچو، چونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں' جانتے تھے کہ ان حرمت والے مہینوں میں لوگ اپنی جانوں پر ظلم اور اپنی طرف سے عبادت کے طریقے گڑھ کر ان پر عمل کرنا شروع کر دیں گے، اس لیے فرمایا کہ اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔

محرم کا مہینہ بھی ایک ایسا ہی مہینہ ہے، جس کو قرآن کریم نے حرمت والا مہینہ قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ چار مہینے حرمت والے ہیں، ان میں سے ایک مہینہ محرم کا ہے۔ شیعہ حضرات محرم الحرام کے مہینہ میں جو کچھ کرتے ہیں، وہ اپنے مسلک کے مطابق کرتے ہیں، بہت سے اہل سنت حضرات بھی ایسی مجلسوں میں، تعزیوں اور ان کاموں میں شریک ہو جاتے ہیں جو بدعت اور منکر کی تعریف میں داخل ہیں، قرآن کریم نے تو صاف حکم دیا ہے کہ ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کریں، بلکہ ان اوقات کو اللہ کی عبادت میں اور اس سے دعائیں کرنے میں صرف کریں، اور ان فضولیات سے اپنے آپ کو بچائیں۔

محرم کی دسویں تاریخ کو عاشوراء کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں: ''دسواں دن'' یہ دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک خصوصی رحمت اور برکت کا حامل ہے، حضور ﷺ نے عاشوراء کے دن کا روزہ رکھنے کو سنت اور مستحب قرار دیا ہے، ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''مجھے اللہ عزوجل کی رحمت سے امید ہے کہ جو شخص عاشوراء کے دن کا روزہ رکھے گا تو اس کے پچھلے ایک سال کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا۔'' جب اللہ تعالیٰ نے اس دن کو اپنی رحمت اور برکت کے نزول کے لیے منتخب کر لیا ہے تو اس کا تقدس یہ ہے کہ اس دن کو اس کام میں استعمال کیا جائے جو کام نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق ہو، اور سنت کے طور پر اس دن صرف ایک حکم دیا گیا ہے کہ روزہ رکھو۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی جب عاشوراء کا دن آتا تو آپ ﷺ روزہ رکھتے، لیکن وفات سے پہلے جو عاشوراء کا دن آیا تو آپ ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ۱۰ محرم کو ہم بھی روزہ رکھتے ہیں اور یہودی بھی روزہ رکھتے ہیں، لہٰذا اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو صرف عاشوراء کا روزہ نہیں رکھوں گا، بلکہ اس کے ساتھ ایک روزہ اور ملاؤں گا، تاکہ یہودیوں سے مشابہت ختم ہو جائے۔

رسول کریم ﷺ کے اس ارشاد میں ہمیں ایک اور سبق بھی ملتا ہے کہ جب عبادت، بندگی اور نیکی کے کام میں بھی نبی کریم ﷺ نے مشابہت پسند نہیں فرمائی تو اور کاموں میں اگر مسلمان ان کی مشابہت اختیار کریں تو یہ کتنی بری بات ہوگی۔ افسوس ہے کہ آج مسلمانوں کو اس حکم کا خیال اور پاس نہیں رہا، اپنے طریقۂ کار میں، وضع و قطع میں، لباس پوشاک میں، اٹھنے بیٹھنے کے انداز میں، کھانے پینے کے طریقوں میں، زندگی کے ہر کام میں ہم نے غیر مسلموں کے ساتھ مشابہت اختیار کر لی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد:۱۱ ستمبر/۲۰۱۹ء - محرم الحرام/۱۴۴۱ھ شمارہ:۹

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

محرم الحرام کی فضیلت

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

"أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ صِيَامِ شَهْرِ رَمَضَانَ شَهْرُ اللّٰهِ الْمُحَرَّمُ"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(رمضان کے مہینہ کے روزوں کے بعد سب سے افضل ترین روزے محرم کے مہینہ کے ہیں۔)

(سنن الترمذی، کتاب الصوم، باب ما جاء فی صوم المحرم: ۷۴۵)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.10 E-Mail: markazulimam@gmail.com سالانہ زرتعاون: -/Rs.100

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

ایک مرد خدا کی وصیت (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

خلفائے راشدین-وحدت مزاج ووحدت منہاج.....۴

.....مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

صحابۂ کرام کا رتبہ.....۶

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا.....۸

.....مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

سچائی کیا ہے؟.....۱۰

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

بنی اسرائیل سے عہد و پیماں.....۱۲

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

احکام قربانی.....۱۴

.....مفتی راشد حسین ندوی

محرم الحرام کی بدعات.....۱۷

.....ادارہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ملک شام کا دوسرا سفر.....۱۸

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

حالات حاضرہ اور مسلمان.....۲۰

.....محمد نفیس خاں ندوی

نذرِ حسینؓ

نتیجۂ فکر:- جناب ماہر القادریؒ

اجل کو دیکھ کے جب مسکرا دیا تو نے
حنین و بدر کا منظر دکھادیا تو نے

ہے زیب صفحۂ تاریخ تیری قربانی
خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دیا تو نے

فرات دے نہ سکی گرچہ دردِ تشنہ لبی
مگر خلوص کا دریا بہادیا تو نے

ترے نثار کہ شہ رگ کا خون ٹپکا کر
خدا کے دیں کا چمن لہلہا دیا تو نے

جناب حر کے مقدر کا اوج کیا کہنا
حقیر ذرے کو سورج بنادیا تو نے

وہ بھید جس کو نہ سمجھی کبھی نگاہِ خرد
شہید ہوکے جہاں کو دکھا دیا تو نے

مری نگاہ میں جچتی نہیں شہنشاہی
نہ جانے کون سا عالم دکھا دیا تو نے

مدیر کے قلم سے

ایک مرد خدا کی وصیت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

"لن یصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها" اس امت کے آخری لوگوں کی اصلاح اسی چیز سے ہوگی جس سے امت کے اولین لوگوں کی اصلاح ہوئی ہے۔ یہ امت کی صلاح وفلاح کا وہ نسخہ ہے جس کا اسلام کی ساڑھے چودہ سو سالہ تاریخ میں بار بار تجربہ کیا گیا ہے، اور ہر بار اس کے کامیاب نتائج سامنے آئے ہیں، کہیں وسیع پیمانہ پر اور کہیں محدود پیمانہ پر، آج مسلمانوں کے زوال کے مختلف اسباب تلاش کیے جاتے ہیں مگر بہت کم لوگ اس حقیقت تک پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب ایمان اور اخلاق کا دیوالیہ پن ہے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو دنیا میں بھی جو مقام ملا وہ ایمان واخلاق سے ملا، یہ وہ مضبوط اور ٹھوس بنیادیں ہیں کہ ان پر فلک بوس عمارتیں تعمیر کی جاسکتی ہیں۔

مکہ مکرمہ میں جب کوہ صفا سے آنحضور ﷺ نے دعوت توحید دی تو چند لوگ ایمان لائے مگر وہ ایمان صدیقی رکھنے والے لوگ تھے، ان کے اخلاق کی سطح بہت بلند تھی، جن کے ذریعہ سے بڑی تعداد اسلام میں داخل ہوئی اور اسی ایمان واخلاق کی بلندی نے ان کو دنیا میں حکمرانی عطا کی اور اسی ایمان واخلاق کی بنیادوں پر علمی ترقیاں ہوئیں اور وہ دنیا پر چھا گئے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ آج مسلمانوں نے ان بنیادوں کو فراموش کر دیا، وہ ریت پر فلک بوس عمارتیں بنانا چاہتے ہیں، ہر سطح پر جو بگاڑ اور انتشار نظر آتا ہے اس کا سب سے بڑا سبب ایمان واخلاق کا فقدان یا اس کی زبردست کمی ہے، اس وقت سب سے زیادہ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، اور یہی ایمان واخلاق کی طاقت ہے جو غیروں کو متاثر کرتی ہے، یہ دعوت کی عملی اور سب سے کامیاب شکل ہے، ایمان کی گہرائیوں کے ساتھ جب اسلامی اخلاق دنیا کے سامنے آئیں تو کیسا ہی سخت دل انسان ہو، وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس وقت سب سے زیادہ کمی ان ہی اخلاق کی ہے، ہم اپنی اپنی مسجدوں اور مدرسوں میں لگے رہیں لیکن اپنے اخلاق کو درست نہ کریں اور اسلام کا یہ پہلو جس سے اسلام کی صحیح تصویر سامنے آسکتی ہے لوگوں کے سامنے نہ آئے تو یہ انتہائی خطرناک بات ہے، اور آج مسلمانوں کے زوال کا یہ بڑا سبب ہے۔

ہمارے ایک انتہائی مخلص بزرگ بھائی عبدالرشید صاحب حیدرآبادی جو نصف صدی سے حرمین شریفین کی خدمت میں مصروف ہیں، تبلیغی جماعت سے قدیم تعلق رکھتے ہیں، اس مرتبہ تشریف آوری کے موقع پر انہوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا، جب وہ کئی سال پہلے ازبکستان جماعت میں تشریف لے گئے تھے، تو وہاں ایک بزرگ سے ان کا تعارف کرایا گیا، اس وقت ان کی عمر اسّی سے متجاوز تھی، انہوں نے جماعت کے احباب کو مخاطب کر کے فرمایا: ایک زمانہ تھا یہ علاقہ مسلمانوں کا علمی وروحانی مرکز سمجھا جاتا تھا، امام بخاری وترمذی یہیں پیدا ہوئے، بڑے بڑے مشائخ پیدا ہوئے، یہاں کا معمولی شخص کہیں اور جاتا تو اس کو امام بنایا جاتا مگر پھر "اشتراکی انقلاب" آیا۔ وہ کہنے لگے کہ مجھے یاد ہے چوراہے پر ہماری بیویوں بچیوں کو جمع کیا گیا، اور ان کو حکم ہوا کہ وہ برقع اتار کر اپنے ہاتھ سے ان میں آگ لگائیں، ورنہ ان کو آگ میں ڈال دیا جائے گا، میری اہلیہ تیار نہ ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں ان کو آگ میں ڈال دیا گیا، میں نے بچیوں سے کہا کہ برقع اتار کر آگ لگادو اور گھروں میں داخل ہوجاؤ، وہ شریف بچیاں برقع اتار کر گھروں میں داخل ہوئیں تو ان کے جنازے ہی باہر نکلے، وہ بزرگ بولے: جانتے ہیں حالات کیوں خراب ہوئے؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم نے یہاں کی غیر مسلم آبادی کو نظر انداز کر دیا، ہم نے ان میں کام نہیں کیا، پھر انہوں نے کہا کہ تم ہندوستان جا کر میری وصیت پہنچا دینا کہ ابھی مسلمانوں کے پاس موقع ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں، غیروں کے سامنے اسلامی اخلاق کا نمونہ پیش کریں اور ان میں کام کریں، ورنہ خدانخواستہ ہندوستان میں بھی وہی حالات نہ پیدا ہوجائیں جو یہاں ازبکستان میں ہیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے برما کے مسلمانوں کو بھی اسی خطرہ سے آگاہ کیا تھا کہ اگر غیروں میں کام نہ ہوا تو وہ دن آنے والے ہیں کہ زندگی تنگ ہوجائے گی، ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اب یہی راستہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق سے دلوں کو جیتنے کی کوشش کریں، اور اسلام کا نظام اخلاق، ایمان کی طاقت اور یقین کے ساتھ برادران وطن کے سامنے پیش کریں، اور ہر ضروری اور اہم کام سے پہلے اس کو اہم سمجھیں کہ یہ ہمارا اخلاقی فریضہ بھی ہے، دینی فریضہ بھی، یہی ہمارے تحفظ کا بھی راستہ ہے اور یہی دعوت دین کا سب سے محفوظ، مؤثر اور طاقتور قدم ہے۔

خلفائے راشدین

وحدت مزاج و وحدت منہاج

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

خلافت راشدہ کیا ہے؟ خلافت راشدہ نہ اسلامی مملکت کی وسعت کا نام ہے، نہ کثرت فتوحات کا، نہ کامیابیوں کے تسلسل کا، اگر معیار یہی ہو تو پھر ولید بن عبدالملک اور ہارون الرشید کو سب سے بڑا خلیفۂ راشد ماننا پڑے گا، خلافت راشدہ نام ہے نبی کے مزاج اور طرزِ زندگی میں نیابت کاملہ کا، نبوت کا امتیازی مزاج کیا ہے؟ ایمان بالغیب کی قوت، اطاعت الٰہی کا جذبۂ صادق و کامل، غیب پر شہود، احکام پر مصالح و فوائد کو قربان کرنا، دنیا پر آخرت اور غنا پر فقر و زہد کو ترجیح دینا، اسباب دنیا سے کم سے کم متمتع ہونا اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ متمتع کرنے کی کوشش کرنا، یہ وہ اجمال ہے جس کی تفصیل پوری سیرت محمدی ہے اور جس کے مظاہر بدر و خندق کے معرکے، تبوک کا سفر، حدیبیہ کی صلح، مکہ کی فتح اور ۲۳ برس کی وہ زاہدانہ زندگی ہے جس کا اول شعب ابی طالب کی اسیری اور جس کا آخر زندگی کی وہ آخری شب ہے جس میں گھر میں چراغ بھی نہ تھا اور زرہِ نبوی تیس صاع جَو کے عوض میں ایک یہودی کے یہاں رہن تھی۔

اس معیار سے ان خلفائے راشدین (رضي الله عنهم وأرضاهم) کی زندگی اور دورِ خلافت، خلافت راشدہ کا مکمل نمونہ تھا جس میں نبی ﷺ کے مزاج اور طرزِ زندگی کی پوری نمائندگی تھی، واقعۂ ارتداد میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بے نظیر صلابت و استقامت اور اس فتنہ عالم آشوب میں مٹھی بھر جماعت صحابہ کے ساتھ پورے ملک عرب سے جنگ کرنے کا عزم اور فیصلہ، پھر عین اس نازک وقت میں جب کہ ایک ایک سپاہی جیش کا قائم مقام تھا، اور اسلام کا مرکز ثقل (مدینہ طیبہ) دشمنوں کے نرغہ میں تھا، جیش اسامہ کو شام کی جانب روانہ کردینے اور منشاء نبوی کی تکمیل پر (حالات و تغیرات کا لحاظ کیے بغیر) اصرار، پھر مسلمانوں کی موت و حیات کی اسی فیصلہ کن گھڑی میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہتوں (رومۃ الکبری اور فارس اعظم) میں جنگ کا سلسلہ چھیڑ دینا، ایمان و اطاعت کا وہ واقعہ ہے جس کی نظیر صرف انبیاء اور ان کے خلفائے اولوالعزم کی تاریخ میں مل سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ زمانہ خلافت و فتوحات میں ایسی زاہدانہ زندگی گزارنا جس میں بیت المال کے روزینہ سے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے اور بچوں کا منہ میٹھا کرنے کی بھی گنجائش نہ تھی اور پھر انتقال کے وقت اس پوری رقم کو جو زمانۂ خلافت میں (مسلمانوں کے فیصلے سے) بیت المال سے اپنی گزراوقات کے لیے لی تھی، ذاتی زمین فروخت کرکے بیت المال کو واپس کردینے اور اس پورے سامان کو جس کا خلافت کے دور میں اضافہ ہوا تھا، بیت المال میں منتقل کردینے کی وصیت، زہد و ایثار کے ایسے واقعات ہیں جن کی نظیر شاید انبیاء علیہم السلام کی زندگی کے علاوہ کہیں اور نہ مل سکے اور جو اسی اصل کا "ظل" ہے جس کی خلافت اولیٰ کا شرف ان کو حاصل تھا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کا روم و شام کی جنگوں اور یرموک و قادسیہ کے معرکوں میں افواج کی تعداد و اسلحہ کے بجائے اللہ کی فتح و نصرت اور اسلامی افواج کے اعمال و اخلاق اور تعلق باللہ پر اعتماد، یرموک معرکہ کے موقع پر (جس سے سخت معرکہ تاریخ اسلام میں کم پیش آیا ہوگا) اسلام کے مظفر و منصور قائد اور اسلامی افواج کے محبوب و معتمد سپہ سالار خالد بن الولید کو اسلامی افواج کی قیادت علیا سے معزول کردینا اور ابوعبیدہؓ جیسے نرم خو و نرم مزاج کو قائد مقرر کرنا، عظیم ترین عمال حکومت کا بے لاگ احتساب، جبلہ بن الایہم جیسے سردار قوم اور بادشاہ پر ایک غریب فزاری کے مقابلہ و معاملہ میں قصاص جاری کرنا، ایسی ایمان و اطاعت کی مثالیں ہیں جو نبوت کا مزاج اور خلافت راشدہ کا تمغۂ امتیاز ہے۔

پھر ان کا زہد و احتیاط جس نے عام الرمادہ (قحط عام) میں ان کو ہر ایسی غذا سے باز رکھا جو عام مسلمانوں اور ان کی وسیع مملکت کی عام آبادی کو میسر نہیں تھی، یہاں تک کہ لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر اس قحط نے طول کھینچا تو وہ بچ نہیں سکیں گے، اور ان کی زاہدانہ زندگی اور تقشف جس نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلی ہے، اسی زاہدانہ زندگی کا پرتو ہے جس کی اصل و ظل رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلیفہ اول کی نیابت ان کے حصہ میں آئی تھی۔

اسی طرح وہ ثبات واستقامت اور وہ عزم ویقین جس کا اظہار حضرت عثمانؓ نے بلوائیوں کی شورش اور ترک خلافت کے مقابلہ کے موقع پر کیا، اور بالآخر مظلومانہ شہادت پائی پھر اسباب غنا کی فروانی و موجودگی میں اپنی ذاتی زندگی میں اس زہد وایثار کا جوان کے تین نامور پیشرؤوں کی میراث تھی، حکومت کے مہمانوں اور عام مسلمانوں کو امیرانہ اور پرتکلف کھانا کھلانا اور خود گھر میں جاکر زیتون کے تیل سے روٹی کھانا وہ صحیح خلافت ہے، جس کی خلعت حضور ﷺ نے ان کو پہنائی اور جس کے اتارنے سے انہوں نے صاف انکار کردیا۔

خلافت نبوت کا یہی مزاج اور زندگی کا یہی انداز اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ابن عم رسول ﷺ کی زندگی میں پورے طور پر نمایاں وروشن ہے، اس طلائے خالص اور اس جوہر اصلی پر جمل اور صفین کی جنگوں کا جو عارضی غبار پڑ گیا ہے، اس کو اگر آپ ہٹادیں، تو اس گوہر آبدار کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کرے اور خلافت نبوت کے وہ تمام خصائص نظر آجائیں جو اس کے تین پیشرؤوں اور زندگی کے رفیقوں میں مشترک ہیں، حکم اور اصول پر مصلحت وسیاست کو قربان کرنا، خلافت کے بقاء واستحکام کے لیے ان تمام طریقوں اور تدبیروں کے اختیار کرنے سے انکار کردینا جو اہل حکومت اختیار کرتے ہیں، لیکن خلافت نبوت کے امین کے لیے ان کی گنجائش نہیں، عمال حکومت اور اراکین مملکت میں سے ایسے اصحاب کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کردینے میں تامل نہ کرنا جو اس کی نظر میں ورع وتقوی کے اس بلند معیار پر نہیں، جس پر رسول ﷺ اور اس کے خلفاء چھوڑ کر گئے ہیں، اور جو اس نظام خلافت کے شایان شان ہے، اصول وعقیدہ کی خاطر اور خلافت کو ''منہاج نبوت'' پر باقی رکھنے کے لیے ان تمام ناخوشگوار فرائض کو انجام دینا جو اس کے لیے سوہان روح تھے، لیکن عقیدہ اور مومن کے یقین کا تقاضا اور وقت کا مطالبہ تھا، خلافت کی پوری مدت کو ایک مسلسل مجاہدہ، ایک مسلسل کشمکش، ایک مسلسل سفر میں گزارنا لیکن نہ تھکنا، نہ مایوس ہونا، نہ بددل ہونا، نہ شکایت کرنا، نہ راحت کی طلب، نہ محنت کا شکوہ، نہ دوستوں کا گلہ، نہ دشمنوں کی بدگوئی، مدح وذم سے بے پروا، جان سے بے پروا، انجام سے بے پروا، نہ ماضی کا غم، نہ مستقبل کا اندیشہ، فرض کا ایک احساس مسلسل اور سعی کا ایک سلسلہ غیر منقطع، دریا کا سا صبر، سورج اور چاندی کی سی پابندی، ہواؤں اور بادلوں کی سی فرض شناسی، معلوم ہوتا ہے جس طرح ذوالفقار ان کے ہاتھ میں سرگرم وبے زبان ہے، اسی طرح وہ کسی اور ہستی کے دست قدرت میں سرگرم عمل اور شکوہ وشکایت سے ناآشنا ہیں۔

ایمان واطاعت کا وہ مقام ہے جو ''صدّ یقین'' کو حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کا پہچاننا اور ان نزاکتوں اور مشکلات سے واقف ہونا بڑے صاحب نظر اور صاحب ذوق کا کام ہے، اس لیے ان کی زندگی اور ان کی عظیم شخصیت کا پہچاننا ایک بڑا امتحان بن گیا ہے، اور وہ اہل سنت کا ایک امتیاز ہے، اس ایمان بالغیب اور اس جذبہ اطاعت کا ظہور جس ماحول اور جس ناخوشگوار واقعات کی شکل میں ہوا، وہ اس ماحول اور ان واقعات سے بہت مختلف تھے، جن میں ان کے پیشرو خلفاء کے ایمان بالغیب اور جذبہ اطاعت کا اظہار ہوا تھا، اس لیے بہت سے مؤرخین اور اہل قلم اور مدعیان فکر ونظر بھی اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے، وہ جس کو داخلی فتنے اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کہتے ہیں، ہم ان میں حضرت علیؓ کو نہ صرف معذور بلکہ ماجور پاتے ہیں، ہم اگرچہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ فریق مقابل (اہل شام) ایک اجتہادی غلطی کا مرتکب تھا، اس لیے اس کی تضلیل وتفسیق ہرگز درست نہیں، لیکن ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی خلافت میں جو کچھ کیا وہ ایمان واطاعت کے جذبہ، اور ادائے فرض کی روح کے ساتھ کیا، اس لیے یہ عمل ان کے لیے تقرب ورفع درجات کا باعث تھا۔

پھر ان کی زاہدانہ زندگی خلافت نبوت کا پرتو کامل اور خلافت صدیقی وخلافت فاروقی کا نور تھی، یہ فقر وزہد، تقشف وقناعت کی ایسی زندگی تھی کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے زہاد اس میں ان کی ہمسری نہیں کرسکتے تھے، اور بالآخر ان کے منتخب عمال حکومت اور ان کے قریب ترین عزیز بلکہ حقیقی بھائی عقیل بن ابی طالب بھی ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ درحقیقت آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام میں جو ایمان بالغیب اور ایمان بالآخرۃ پیدا کیا، اس نے ان کے ذہن ودل، سیرت واخلاق، زندگی اور کردار اور معیشت وسیاست کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا، عسر ویسر، کامیابی وناکامی، فقر وفاقہ اور امارت وحکومت میں اسی کا بے تکلف اظہار ہوتا تھا، اس ایمان کے سلسلہ معجزات کی سب سے طاقتور اور سب سے نمایاں وممتاز کڑیاں خلفائے راشدین ہیں، وہ اسی معنی میں خلفائے راشدین ہیں کہ نبوت کا یہ مزاج اور نبی کی یہ میراث ان کی طرف منتقل ہوئی اور انہوں نے اس مزاج ومنہاج میں نبی کی کامل نیابت کی۔

صحابہ کرامؓ کا رتبہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَداً﴾ (الکھف: ۲۷)

(اور آپ کے پروردگار کی کتاب کی آپ پر جو وحی ہوئی ہے وہ پڑھ کر سنایئے، اس کی باتیں کوئی بدل نہیں سکتا اور اس کے سوا آپ کو کہیں پناہ کی جگہ مل نہیں سکتی)

آیت بالا میں نبی ﷺ سے فرمایا گیا کہ قرآن مجید کی صورت میں جو وحی تمہیں دی جارہی ہے، یہ لوگوں کے سامنے پڑھیے، یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس کو لوگوں تک پہنچادیجیے، بلکہ فرمایا کہ اس کو تلاوت کیجیے یعنی پڑھتے رہیے، گویا اس چیز کی تلاوت ہونی چاہیے، تاکہ اس سے بعد میں لوگ سبق لیں۔ پھر فرمایا: یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات میں تبدیلی نہیں ہے، یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اللہ نے ایسا کہا ہے تو ہوسکتا ہے کہ کل اس کی ضرورت نہ ہو، اللہ نے یہ صرف آج ہی کے لیے کہا ہے، نہیں! جب اللہ تعالیٰ نے کہا ہے تو پھر وہ قیامت تک ہمارے لیے درس ہے اور قابل استفادہ ہے، اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی ہے۔ ایک طرف جہاں اس کے فرمان میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی ہے، وہاں دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمہیں حفاظت کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ملے گا، یہ سب جتنے بھی سہارے اور ٹھکانے ہیں، جن سے آدمی خود کو خطرہ و مصیبت سے بچاتا ہے، یہ سب بہت کمزور، معمولی اور وقتی سہارے ہیں۔ دنیا کے تمام وسائل اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیے ہیں، دنیا میں جتنے وسائل اور حفاظت کے طریقے ہیں، وہ سب اللہ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ خود بخود ہوں، ہم ان کو اختیار کریں یا نہ کریں، ہمیں سوچنا پڑے گا، نہیں! ہمیں ان کو اختیار کرنا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اختیار کرنے کے لیے ہی بنائے ہیں، دواؤں میں جو اثر ہے اور اس کے علاوہ جو دوسرے وسائل ہیں، یہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، یہ خود سے نہیں بنے ہیں، خود سے جو چیز بنی ہو اس کی حیثیت دوسری ہوتی ہے اور جو کسی نے بنائی ہو اس کی حیثیت دوسری ہوتی ہے، ظاہر ہے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے تو وہ اس میں تصرف بھی کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو بے کار اور بے اثر بھی کرسکتا ہے، اس لیے کہ یہ خود سے نہیں ہیں، بلکہ یہ تابع ہیں، اللہ کی بنائی ہوئی ہیں، لہٰذا اگر تم ان کا سہارا لوگے تو وہ کمزور اور ناپائیدار سہارا ہوگا، اور یہ حقیقت اٹل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تم کوئی اور ٹھکانہ نہیں پاسکتے۔

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطاً﴾ (الکھف: ۲۸)

(اور آپ ان ہی لوگوں کے ساتھ اپنے آپ کو لگائے رکھیے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی کی چاہت میں اور دنیا کی آرائش کی خاطر ان سے اپنی نگاہیں نہ پھیر لیجیے، اور اس کی بات نہ مانئے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کررکھا ہے اور وہ اپنی خواہش کے چکر میں پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے آگے بڑھ چکا ہے)

حضور ﷺ کو اشاعت اسلام کی فکر حد درجہ دامن گیر رہتی تھی، آپ ﷺ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کفار میں جو بڑے بڑے سردار ہیں، بڑے بڑے اغنیاء ہیں، جن کا قوم پر اثر ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مسلمان ہوجاتا ہے تو پوری ایک جماعت مسلمان ہوجائے گی، یعنی جتنے لوگ بھی ان کے زیر اثر ہوں گے، وہ سب مسلمان ہوجائیں گے، اسی لیے آپ ﷺ کو اس طبقہ کے اسلام لانے کی خاص فکر تھی، تاکہ اسلام جلدی پھیلے۔

آیت بالا میں اللہ تعالیٰ اسی ذہنیت کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ یہ جو بڑے بڑے لوگ آپ کے پاس آتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی قوم میں اپنا بہت اثر رکھتے ہیں، آپ ان کے اسلام کی فکر نہ کریں، حقیقت میں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے باغی ہیں، اور اس کی نظر میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے، دنیا میں چاہے ان کی جو قیمت ہو

اور جیسا اثر ورسوخ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا کوئی اثر نہیں ہے، لہٰذا اے نبی (ﷺ)! آپ کو اپنی طبیعت پر جبر کرنا ہوگا۔

آگے فرمایا کہ ان کے مقابلہ میں جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور وہ معمولی درجہ کے لوگ ہیں، ان کو آپ یوں سمجھتے ہوں گے کہ یہ خود تو ایمان لے آئے ہیں لیکن ان کا دوسروں پر کوئی اثر نہیں ہے، اور چونکہ یہ لوگ اب ایمان لے آئے ہیں، لہٰذا اگر ان لوگوں کی ہم زیادہ فکر نہیں بھی کرتے ہیں، تب بھی یہ تو ہمارے ساتھ ہی ہیں، البتہ یہ لوگ جن کے ایمان لے آنے سے سماج پر بہت بڑا اثر پڑ سکتا ہے، ان پر کوشش ومحنت کی جانی چاہیے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ جو لوگ اللہ کو صبح وشام پکارتے ہیں اور اللہ کی رضا کے طالب ہیں، آپ اپنی طبیعت کو ان پر مجبور کیجیے، یعنی ان کے ساتھ رہنے اور انہیں کی طرف توجہ کرنے پر اپنے کو مجبور کیجیے، اور اپنے اس تقاضے کو کہ ہم کسی طرح ان بڑے لوگوں کو مسلمان کرلیں، اس تقاضے کو دبائیے، جتنا پیغام دینا ہو اتنا پیغام دے دیجیے، جتنی بات کہنی ہو اتنی کہہ دیجیے اور اس سے زیادہ کی فکر نہ کیجیے، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ طے کر دیا ہے کہ یہ کافر رہیں گے تو آپ ان کو مسلمان نہیں بنا سکتے، آپ کا کام پیغام پہنچانا اور کوشش کرنا ہے، آپ ان پر زیادہ محنت نہ کیجیے، بلکہ اپنے کو مجبور کیجیے کہ آپ ان غریبوں اور معمولی لوگوں سے وابستہ رہیں جو اللہ کو صبح وشام یاد کرتے رہتے ہیں اور دین کے کام میں لگے رہتے ہیں۔

انہیں لوگوں کے متعلق مزید فرمایا کہ آپ اپنی نگاہوں کو ان لوگوں سے نہ ہٹائیے، ایسا نہ ہو کہ آپ کی نگاہیں ان سے ہٹ جائیں، یعنی ان کو کمتر سمجھیں، آپ ان کو ہرگز کمتر نہ سمجھئے، یہ لوگ اللہ کی نظر میں برتر ہیں، اور جن کو دنیا برتر دیکھ رہی ہے، اللہ کی نظر میں وہ کم تر ہیں، لہٰذا آپ کا رویہ بھی یہ ہونا چاہیے کہ اِن کو آپ برتر سمجھیں اور اُن کو کمتر سمجھیں، البتہ جہاں تک دعوت دینے کی بات ہے وہ ضرور دیں، اِن کو بھی دیں، اُن کو بھی دیں، لیکن اتنا یاد رہے کہ ان لوگوں سے آپ کی نگاہیں نہیں ہٹنی چاہئیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دنیا کی جو خوبیاں اور دنیا کی جو پرکشش باتیں ہیں، ان کی طرف آپ کی نگاہ چلی جائے اور پرکشش باتیں کیا ہیں؟ یعنی جو لوگ بااثر ہیں، جو دنیا چلا رہے ہیں، جن کا لوگوں پر اثر ہے اور جو طاقتور ہیں، ان سے آدمی زیادہ امید قائم کرلے اور جو لوگ کمزور ہیں، ان پر آدمی کو زیادہ توکل نہ ہو، اسی کے پیش نظر فرمایا گیا کہ یہ دنیا کی جو زینت ہے یعنی دنیا میں جو ایک کشش اور اثر ہے، اس کی طرف آپ بالکل بھی ارادہ نہ فرمائیں۔ اس کے بعد دنیاوی اعتبار سے بڑے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے ہٹا دیا ہے تو اس کا دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد سے ہٹ گیا ہے، یہاں یہ دھیان رہے کہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی اجازت ہی سے ہٹا ہے، چونکہ ہر چیز اللہ تبارک و تعالیٰ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو اپنی طرف ہی منسوب کرتا ہے کہ ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے ہٹا دیا ہے، آپ اس کی بات نہ مانیے۔

اس آیت میں جس بات کے ماننے سے منع کیا جا رہا ہے، وہ یہ تھی کہ وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں، لیکن ہمارے لیے ایک مشکل یہ ہے کہ آپ نے اپنے پاس ان معمولی اور گھٹیا لوگوں کو جمع کر رکھا ہے، جن کو ہم کچھ بھی خاطر میں نہیں لاتے ہیں، تو ہم آپ کے پاس کیسے بیٹھیں؟ پہلے آپ ان لوگوں کو ہٹائیے پھر ہم سے بات کیجیے، ایسی صورت میں آپ ﷺ کو بھی خیال ہونے لگا کہ اگر اس طریقہ سے ان تک دین کی دعوت پہنچ جاتی ہے تو اگر کچھ وقت کے لیے یہ لوگ قریب نہ رہیں، الگ رہیں تو بہت بہتر ہے۔ مذکورہ آیت میں اسی کو منع کیا گیا کہ اُن لوگوں سے یہ لوگ بہتر ہیں، آپ اُن کی بات نہ مانئے، اور فرمایا کہ جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے ہٹا دیا ہے، جو دین کی بات نہیں مان رہا ہے، آپ اس کی فرمائش قبول نہ کیجیے، وہ کچھ بھی کہا کریں، لیکن ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔

آگے فرمایا کہ جس نے اپنی خواہش کی پیروی کی ہے، یعنی وہی بڑے لوگ جو دین کا انکار کر رہے ہیں، ان کا اصل معاملہ کوتاہی اور راہ حق سے ہٹنے کا ہے، جو راہ حق قبول نہیں کر رہے ہیں، حالانکہ وہ بالکل واضح ہے۔ فرمایا: ان سے صاف صاف کہہ دیجیے کہ حق بات تمہارے رب کی طرف سے ہے، تم مانو یا نہ مانو، جو چاہے اس کو مانے، تسلیم کرے، ایمان لائے اور جو چاہے اس کا انکار کر دے، اور اپنی جگہ بیٹھا رہے، اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہے، اللہ تعالیٰ بالکل غنی ہے۔

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

اسلام کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس کے ماننے والوں کے درمیان اجنبیت کا کوئی احساس نہیں ہوتا، خواہ وہ دنیا کے کسی خطہ سے تعلق رکھتے ہوں، اور اگر اجنبیت کا احساس ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اندر ایمان کی کمی ہے، یہ کمی کبھی سامنے والے کی طرف سے ہوتی ہے اور کبھی اپنی طرف سے، اور افسوس کی بات ہے کہ اب اس اجنبیت کا احساس اہل اسلام میں بڑھتا جا رہا ہے، جب ایک علاقہ والے دوسرے علاقہ میں جاتے ہیں تو ان کو اجنبیت کا احساس ہوتا ہے، اور ایک مدرسہ والے دوسرے مدرسہ میں جاتے ہیں تو ان کو اجنبیت کا احساس ہوتا ہے، اور ایک حلقہ والے دوسرے حلقہ میں جاتے ہیں تو ان کو اجنبیت کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح ایک زبان سے تعلق رکھنے والے دوسری زبان والوں سے ملتے ہیں تو ان کو بھی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ غرض کہ آج کل یہ احساس بہت تیزی سے پیدا ہوتا جا رہا ہے اور اسی احساس کی وجہ سے ہم خیر کے درجہ سے نیچے آ رہے ہیں اور یہ طے ہے کہ جب ہم خیر کے درجہ سے نیچے آئیں گے تو ہماری خیریت نہیں ہے۔

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کو سراپا خیر بنایا گیا تھا، ارشاد الٰہی ہے: "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ" (تم ہی سب سے بہترین امت ہو) یعنی ہم کو قرآنی زبان میں "خیر امت" کہا گیا تھا، اسی طرح امت محمدیہ کے فضائل میں جو احادیث مروی ہیں، ان کو دیکھ کر بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کو فضیلت کے بہت بلند مقام پر لے جایا گیا تھا اور اس دنیا میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہم کو غیر معمولی بلند مقام عطا کیا گیا تھا۔ لیکن جب ہم ہی خیر پر آمادہ ہونے والے نہ بنیں اور خیر میں شرک کی آمیزش کریں تو پھر ظاہر بات ہے ہم کو اٹھانے کے لیے دوسرا کون آئے گا؟ یہی وجہ ہے کہ آج ساری دنیا میں ہماری خیریت نظر نہیں آ رہی ہے۔

آج بہت سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو عالمی امت بنایا تھا، آفاقی امت بنایا تھا، ایک انسان بنایا تھا اور ہمارے اندر انسانیت رکھی تھی، اور سوئی ہوئی انسانیت کو جگانے کا ہمیں سبق بھی سکھایا تھا، اور یہ ذمہ داری بالخصوص ہمارے اوپر رکھی تھی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم ذمہ داری ادا کرنے والے اور ذمہ داری نبھانے والے بالکل نہیں ہیں، ہم سب جانور ہوتے چلے جا رہے ہیں، ہماری حیوانت بڑھتی جا رہی ہے اور دنیا کا حال یہ ہے کہ وہ ننگا ناچ رہی ہے، نہ جانے کیسی کیسی حرکتیں، کیسی کیسی ظلمتیں اور کیسی کیسی تاریکیاں آج ہمارے چاروں طرف منڈلا رہی ہیں، اور کیسے کیسے فتنے اور کیسی کیسی غیر معمولی حرکتیں آج وجود میں آ رہی ہیں۔ ایسے میں یقیناً ہم سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں یہ سوال ہوگا کہ آپ کو کیا بس اسی لیے پیدا کیا گیا تھا کہ آپ اپنے کپڑے اور اپنے کھانے تک محدود رہیں اور اسی پر جیتے رہیں؟ غور کی بات ہے کہ آخر یہ کون سی زندگی ہے جو ہم جی رہے ہیں؟ اسی خراب زندگی گذارنے کا نتیجہ ہے کہ آج ساری دنیا کی نگاہیں ہمارے اوپر ہیں۔

آج ہمارے مدارس کی تعداد میں بھی خوب اضافہ ہو رہا ہے اور مدارس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین کے قلعے ہیں، لیکن میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آج مدارس کی حقیقت بھی یہ بن کر رہ گئی ہے کہ وہاں علم گھٹتا جا رہا ہے اور کتابیں بڑھتی جا رہی ہیں، یہ ایک عجیب حالت ہے، ظاہر بات ہے جب ہمارے دینی قلعوں کی یہ حالت ہو جائے گی تو اس کے بعد دنیا کی دیگر اقوام کے سامنے ہمارا کیا وزن باقی رہ جائے گا؟ اور جب ہم باوزن نہیں رہیں گے تو ہم کو جو چاہے گا وہ مارے گا، ہم کو جو چاہے گا وہ اچھالے گا، جس طرح گیند ماری جاتی ہے، اچھالی جاتی ہے، وہی حالت ہماری بن جائے گی۔

حدیث شریف میں قرب قیامت کی بہت سی علامات کے ساتھ دو علامتیں یہ بھی بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ تم پر دنیا کی قومیں اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جیسے بھوکے پیالہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور دوسری یہ کہ تمہاری حیثیت سیلاب کے جھاگ کی مانند ہوگی، غور کیا جائے تو آج دونوں ہی باتیں پائی جا رہی ہیں، گویا ہم پیالہ ہو گئے اور سارے لوگ نوالہ سمجھ کر پیالہ پر ٹوٹ پڑے، اور جو کچھ اس میں ہے اس پر ٹوٹ پڑے، اور ہماری حیثیت بالکل جھاگ کے برابر رہ گئی۔ اس کے بعد ہم چاہے ان کو اپنے من میں کتنی بھی گالیاں دیں،

اس سے کوئی خیر کی امید نہیں کی جاسکتی، یاد رکھئے کہ گالی دے کر کوئی قوم پنپا نہیں کرتی، اور آپ یہ بھی یاد رکھئے کہ بڑی لمبی تقریر کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ جو چیز اثر انداز ہوتی ہے، وہ انسان کی اپنی شخصیت کا وزن ہے کہ اس کے اندر خیر امت کے کتنے اوصاف پائے جارہے ہیں۔

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو باوزن بنایا ہے، وہ اس طرح کہ آدم کا پتلہ بنا کر فرشتوں کو حکم دیا کہ سجدہ کرو، گویا آپ کو مسجود بنادیا یعنی بھاری بنادیا، اور یہ بھی بتادیا کہ آپ مسجود ہیں لہٰذا ساجد نہ بنئے گا، راکع نہ بنئے گا اور کسی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے نہ رہیے گا، کیونکہ آپ کو فرشتوں کا مسجود بنایا گیا ہے، اس لیے آپ صرف خدا کے آگے سر جھکائیں، باقی کسی کے آگے سر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہم واقعۃً اتنے بھاری تھے کہ جس پلڑے میں رکھ دیئے جاتے وہ پلڑا جھک جاتا، ہم جس جگہ کھڑے ہوجاتے وہ جگہ بلند ہوجاتی اور جس کسی کام میں ہم لگ جاتے تو وہ کام اپنی منزل کو پہنچ جاتا، لیکن ہم لوگوں نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا اور شرکیہ فضاؤں سے متاثر ہونے کے نتیجہ میں ہم بہت ہلکے ہوگئے، چنانچہ آج صورت حال یہ ہے کہ ہمارا عقیدۂ توحید داؤ پر چڑھا ہوا ہے، حتی کہ اس وقت دیندار طبقہ کا عقیدہ بھی صحیح نہیں ہے، جب کہ نبی ﷺ نے صاف فرمادیا ہے: "شفاعتی لمن لا یشرك باللّٰہ شیئا" (میری شفاعت کا حقدار وہی ہوگا جو اللہ کے ساتھ ذرہ برابر بھی شریک نہ ٹھہراتا ہو) حدیث میں "شیئا" کا لفظ ہے، "أحدا" نہیں ہے، اور "شیئا" کا مطلب ہے "ذرہ برابر"، اس لیے کہ شرک' پاخانہ پیشاب کی طرح نجس العین ہے، اس کا ایک چھینٹا بھی زندگی میں نہیں آنا چاہیے۔

آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اندر وزن پیدا کریں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن و حدیث سے سو فیصد وابستہ ہوجائیں، جن سے وابستگی گمراہی سے نجات کی ضامن ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم علوم دینیہ میں رسوخ حاصل کریں، اس لیے کہ جب ہم باوزن ہوجائیں گے تو ہم کو سخت سے سخت آزمائشیں بھی نہیں ہلاسکتیں، ہم کو کوئی ڈانواڈول نہیں کرسکتا، ہم کو کوئی پریشان نہیں کرسکتا۔ آج ہم پر چہار طرفہ جو نگاہیں اٹھ رہی ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم بہت ہلکے ہوگئے ہیں، جس طرح بعض لڑکے کلاس میں بہت سیدھے ہوتے ہیں اور شرارتی لڑکے ان سے مذاق کرتے ہیں، کوئی ادھر سے ٹیپ مارتا ہے، کوئی ادھر سے ٹیپ مارتا ہے، اور پھر لڑکے اچھلتے ہیں کہ کس نے مارا، اور وہ بے وقوف سمجھ نہیں پاتا ہے کہ کس نے مارا، ٹھیک اسی طرح آج ہم بھی سب سے ٹیپ کھا رہے ہیں، کوئی ادھر سے مار رہا ہے، کوئی ادھر سے مار رہا ہے، اسی لیے مسلم علاقوں میں کبھی یہاں فساد کی خبر نظر آتی ہے اور کبھی وہاں ہنگامہ کی خبر نظر آتی ہے۔ یہ سب اسی لیے ہورہا ہے کہ ہم سب ہلکے ہوگئے، اگر ہم بھاری ہوتے تو واقعہ یہ ہے کہ "زندہ باد" اور "مردہ باد" قسم کے نعروں کا کچھ فساد ہی نہ ہوتا۔

بقائے انفع کا قانون خدا کا بے لاگ قانون ہے، ارشاد ہے "بس جھاگ تو بیکار جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے" اس سے بات واضح ہوگئی کہ جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، اس کو کوئی نہیں بہا سکتا، البتہ بے نفع چیز ایسے ہی بہہ جاتی ہے جیسے جھاگ بہہ کر چلا جاتا ہے۔ اس کی روشنی میں ہم خود کو دیکھیں تو آج ہماری حالت ایسی ہوچکی ہے کہ ہمارے ہاتھ میں موبائل آگیا یا اپنی انرجی ضائع کرنا کا کوئی اور کھلونا ہمیں مل گیا، تو ہم رات دن اسی میں مصروف رہتے ہیں، غور کا مقام ہے کہ کیا یہی ہمارے دیکھنے کی چیزیں ہیں؟ کیا انہیں چیزوں سے ہم دنیا میں اپنی نافعیت کا ثبوت پیش کررہے ہیں؟ ظاہر بات ہے جو قوم ایسی معمولی چیزوں میں بہہ جائے تو وہ کہاں باقی رہ سکتی ہے؟

کڑوی مگر حقیقی بات یہی ہے کہ آج ہمارا ضمیر تنگ ہوگیا ہے، ہم معمولی مقاصد کے لیے زندگی گذارنے پر قانع ہوگئے ہیں، ہم چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور چھوٹے چھوٹے مدرسوں کی سیاست میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ہم دنیا کے لیے کچھ کرسکتے ہیں اور کسی کو اپنا پیغام دے سکتے ہیں؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اندر آفاقیت پیدا کریں، عالمیت پیدا کریں، انسانیت پیدا کریں اور اپنے اندر وزن پیدا کریں اور پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں کیا کیا انعامات ملتے ہیں اور ہم سے دنیا کی امامت کا کیسا غیر معمولی کام لیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

مسلسل

سچائی کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

''صدق'' سچائی کو کہتے ہیں، اردو میں اس کا استعمال کسی حد تک محدود معانی کے لیے ہوتا ہے، اور عربی میں جو ''صدق'' کا استعمال ہے، اس میں بڑی وسعت ہے، اس میں قول کی سچائی، عمل کی سچائی اور پھر ظاہر و باطن کی یکسانیت، یہ ساری باتیں شامل ہیں۔ اس لیے کہ جو ''کذب'' ہے یعنی جھوٹ، وہ بالکل اس کا اپوزٹ ہے، اور اس میں بھی وہی وسعت ہے جو عربی کے اندر ''صدق'' میں ہے۔ جھوٹ جو آدمی اپنی زبان سے بولتا ہے وہ بھی جھوٹ ہے اور جو عمل سے مظاہرہ کرتا ہے، وہ بھی جھوٹ ہی کی ایک قسم ہے، اسی لیے ایک حدیث میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ آدمی اگر کسی ایسی چیز کا مظاہرہ کر رہا ہے جو اس کے اندر نہیں ہے، وہ ایسا لباس پہنتا ہے جو گویا کہ صرف ایک دکھاوا ہے اور حقیقت سے خالی ہے، حدیث شریف میں اس کو "کَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ" کہا گیا ہے، جیسے کوئی جھوٹا پہناوا پہنے، اوپر بھی جھوٹا لباس اور نیچے بھی جھوٹا لباس، کرتا بھی جھوٹا اور ازار بھی جھوٹا یعنی سر سے پاؤں تک جھوٹ ہی جھوٹ۔ اسی طرح سچائی ہے، اس میں بھی درجے ہیں، ایک زبان کی سچائی ہے اور ایک عمل کی سچائی ہے اور ایک سچائی ایسی ہے جو اندر سے پھوٹتی ہے۔

صدق مجسم:

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب خطاب کیا گیا تو ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ﴾ کہا ہے، جب ان سے ان کے زندان کے دو ساتھیوں نے خواب کی تعبیر پوچھی تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ان میں سے ایک سے کہا تھا کہ جب تم بادشاہ کے پاس خادم بنو تو مجھے یاد رکھنا اور میرا تذکرہ کرنا، مگر وہ بھول گیا، پھر بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر اس کے سمجھ میں نہیں آئی اور اس کے آس پاس جو اس کے قریب رہنے والے درباری تھے، وہ بھی نہیں سمجھ سکے، اسی وقت اس ساتھی کو یاد آیا کہ یوسف علیہ السلام نے ہمارے خواب کی تعبیر ہم کو بتائی تھی، ہمیں ان سے رجوع کرنا چاہیے، پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آیا تھا اور اس وقت جو خطاب کیا تھا تو اس میں یہی کہا تھا کہ ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ﴾ گویا وہ صدق مجسم تھے، دراصل اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ تھا جو پیش آچکا تھا، اور جس کی وجہ سے یوسف علیہ السلام کو جیل جانا پڑا تھا، جس میں حضرت یوسف علیہ السلام یہ فرماتے تھے کہ یہ جو اس گھر کی خواتین ہیں، یہ ان کی چالیں ہیں اور میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، لیکن عزیز مصر کی بیوی نے پھنسایا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو جب اندازہ ہوا کہ یہ میری آزمائش ہے تو انہوں نے فرمایا کہ اے اللہ! اگر جیل بہتر ہے تو اسی کا سامان کر دے، لہٰذا وہ جیل چلے گئے، اب جب یہ سارا واقعہ ہوا تو ان کی سچائی ان کے ساتھی نے دیکھی کہ ان کی کیا زندگی ہے، اسی لیے جب خطاب کیا تو ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ﴾ کہا، اس لیے کہ ان کی سچائی ان کے عمل سے پھوٹتی تھی۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ''صدیق'' اسی لیے کہا گیا کہ وہ سراپا صدق تھے، صدق مجسم تھے، حضرت صدیق اکبرؓ کا معاملہ یہ تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے اللہ کے نبی ﷺ کی تصدیق کی، وہ خود سچے تھے اور سچ کو سچ کہنے والے، سچ کو سچ ماننے والے اور اس سچائی کو پھیلانے والے تھے، تصدیق کرنے والی سب سے پہلی جو شخصیت ہے وہ صدیق اکبرؓ کی ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ اس کا تذکرہ ہے: ﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ﴾ (الزمر: ۳۳) (اور جو سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کو سچ مانا)

ایک تو وہ ذات جو سچائی لے کر آئی یعنی اللہ کے نبی ﷺ اور ایک وہ ذات جس نے سب سے پہلے تصدیق کی، اور وہ ہیں حضرت صدیق اکبرؓ، قرآن مجید میں حضرت صدیق اکبرؓ کی یہ بڑی فضیلت کی بات ہے، اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ کئی جگہ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ: ۴۰) (جب وہ اپنے رفیق سے کہہ رہے تھے کہ غم مت کرو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے)

جب حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ غار ثور میں تھے اور دشمن بالکل معلوم ہوتا تھا کہ اگر وہ اپنے قدموں کو دیکھ لیں گے تو ان کی نگاہ ان حضرات پر بھی پڑ جائے گی، ایسی صورت حال میں

حضرت صدیق اکبر کو خیال ہوا کہ اب کیا ہوگا؟ انہوں نے اللہ کے رسول سے یہ صورت حال عرض کی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، وہاں پر قرآن مجید نے جو الفاظ بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ ''جب حضرت محمد ﷺ نے اپنے ساتھی سے کہا'' وہاں ''صاحب'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، گویا کہ صدیق اکبرؓ کی صحابیت نص قرآنی سے ثابت ہے، اللہ نے ان کو جو مقام دیا ہے، وہ مقام کسی کو نہیں دیا ہے، اسی لیے بعض جگہ یہاں تک آتا ہے کہ اگر حضرت صدیق اکبرؓ کے اعمال ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور امت کے اعمال دوسرے پلڑے میں رکھ دیے جائیں تو صدیق اکبر کا جو پلڑا ہے وہ جھک جائے گا۔ اس طرح کی دیگر روایات بھی ہیں جو حضرت عمرؓ اور دوسرے حضرات سے مروی ہیں، غرض کہ حضرت صدیق اکبرؓ صدق مجسم تھے، سراپا سچائی تھے، سچائی کو قبول کرنے والے تھے اور سچائی کو پھیلانے والے تھے۔

نیک صحبت کی ضرورت:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ وَکُونُواْ مَعَ الصَّادِقِیْنَ﴾

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو)

سچائی عین ایمان ہے، انسان کے اندر اگر جھوٹ ہے، تو گویا کہ اس کے ایمان کے اندر میل ہے، اس لیے کہ ایمان اور صدق دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جو ایمان آیا وہ سراپا صدق ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آیا، آپ ﷺ پر وحی آئی اور آپ ﷺ نے بے کم وکاست امت تک اس کو منتقل فرمایا، یہاں شروع سے لے کر اخیر تک سچائی ہے، تو یہ سچائی جو ایمان کی ہے، یہ ہر ایمان والے کے لیے لازم ہے اور ہر مومن کو اس کا مکلف کیا گیا ہے کہ وہ سچائی کو اختیار کرے، اور اپنی پوری زندگی اس کے مطابق بنانے کی کوشش کرے، اور یہ وہ سچائی ہے جس کی اہمیت اس قدر ہے کہ مذکورہ آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات فرمائی کہ اے ایمان والو! اللہ کا تقوی اختیار کرو، اللہ کا لحاظ کرو، اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو، یہاں اللہ تبارک تعالیٰ چاہتے تو "کونوا مع المتقین یا مع المصلین" فرما دیتے یا اور کوئی بھی لفظ استعمال ہوتا، لیکن یہاں "کُونُواْ مَعَ الصَّادِقِیْنَ" فرمایا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدق اور سچائی کی اہمیت کتنی ہے اور یہ ایک معیار ہے۔

حق کا معیار:

سچائی آدمی کے حق ہونے کا ایک معیار ہے، اس لیے کہ آدمی اگر جھوٹ بولتا ہے یا جھوٹ کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر حقیقت میں ایمان کی وہ گہرائی نہیں ہے جو مطلوب ہے، اس کے اندر جتنا جھوٹ ہے، اتنا ہی اس کے ایمان میں سطحیت ہے اور جتنی اس کے اندر سچائی ہے، اتنی ہی اس کے ایمان کے اندر حقیقت ہے، اسی لیے فرمایا کہ سچوں کے ساتھ رہو، گویا یہ سچ ایک معیار ہے، اگر آدمی کی زندگی دیکھنی ہے کہ وہ اللہ کا نیک بندہ اور اللہ کا ولی ہے یا نہیں؟ تو سب سے پہلے مرحلہ میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ سچا ہے؟ وہ سچ بولتا ہے؟ اس کی زندگی سچی ہے یا وہ جھوٹ کا سہارا لیتا ہے؟ کیونکہ اس زمانہ کے جو فتنے ہیں، ان میں ایک بڑا فتنہ یہ ہے کہ آدمی سمجھتا ہے کہ جھوٹ سے ہماری دوکان چلے گی، وہ دوکان چاہے مدرسہ کی ہو یا خانقاہ کی ہو، یہ مدرسے اور خانقاہیں سچائی کے مراکز ہیں، یہاں سچ پڑھایا جاتا ہے، سچ بتایا جاتا ہے، اب کوئی اگر یہاں بھی جھوٹ کا سہارا لے تو ظاہر ہے وہ دین کو بدنام کر رہا ہے، وہ مراکز صدق کو گویا کہ بدنام کر رہا ہے اور افسوس کی بات ہے کہ چونکہ لوگوں نے دین کو کمائی کا ذریعہ بنالیا ہے، اس لیے یہ ساری خرافات اب ان جگہوں پر ہو رہی ہیں، حالانکہ حدیث میں آتا ہے کہ اگر کوئی دین کے ذریعہ دنیا کماتا ہے، تو قیامت کے دن اس کو جنت کی خوشبو بھی نہیں ملے گی، ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"لَمْ یَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ" (وہ شخص قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں پا سکے گا) (أبوداؤد: ۳۶۶۶)

حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دین کے ذریعہ سے دنیا کماتا ہے، قیامت کے دن اس کو جنت کی خوشبو بھی نہیں ملے گی اور یہ حقیقت ہے کہ آج دین کے ذریعہ سے جو بھی دنیا کمانے والے ہیں، وہ سب سے زیادہ جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے لڑکے ہیں، ہمارے مدرسہ کا اتنا خرچ ہے، ہماری ایسی خانقاہ ہے اور ہماری ایسی کرامات ہیں اور ایسے خواب ہیں، اب اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ ہے؟ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ جو صورت حال ہے، اس سے سب سے زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے، اس سے دین بدنام ہو رہا ہے۔

بنی اسرائیل سے عہد و پیمان

عبدالسبحان ناخداندوی

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں مادی انعامات اوران پر بنی اسرائیل کی ناشکری کے تذکرہ کے بعد معنوی احسانات اوران سے ان کے اعراض کا ذکر کیا ہے، یعنی اے اسرائیلیو! تم سے میرے اس احسان کی قدر بھی نہ پہچانی گئی، تمہیں جو صاف ستھرے احکامات دیے گئے تھے جن کو اختیار کر کے تم دنیا و آخرت کی سرفرازی پا سکتے تھے، تم نے ان احکامات کا کیا حشر کیا، یہ بھی ہماری زبانی سنو:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْناً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلاً مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ﴾(البقرۃ:۸۳)

(اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ ہی کی عبادت کروگے، کسی اور کی نہیں، والدین کے ساتھ احسان کرنا اور قرابت دار نیز یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ (بھی احسان کرنا) اور لوگوں سے اچھی بات کہنا، نماز قائم رکھنا اور زکاۃ دیتے رہنا، پھر اپنی ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر تم نے پورے طور پر اعراض کرتے ہوئے منہ موڑ لیا)

اللہ کا دین انسان کو انسان سے جوڑنے کے لیے آیا ہے، بچہ چونکہ سب سے پہلے اپنے والدین ہی کو دیکھتا ہے، پھر اپنے اردگرد رشتہ داروں کو دیکھتا ہے، اوران سے مانوس ہوتا ہے، اس لیے قرآن کریم میں والدین اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کی بہت تاکید آئی ہے، تاکہ ایک دوسرے سے وابستگی کا یہ دائرہ بڑھتے بڑھتے پوری انسانیت کو اپنی آغوش میں سمیٹ لے، اس مبارک آیت میں بھی والدین، قرابت دار اور یتامی و مساکین کے تذکرہ کے بعد پھر تمام انسانوں کے ساتھ اچھے انداز سے پیش آنے کا حکم ہے۔

غور کیا جائے تو یہ صحیح عقیدہ پر صالح معاشرت کو قائم کرنے کے احکامات تھے، اس میں اس کا اشارہ ہے کہ سچی بندگی کے بغیر اچھا معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا، اس میں ایسے ایسے نہ دکھائی دینے والے جھول ہوں گے جو معاشرے کو متعفن بنادیں گے، بھلے وہ جس قدر خوشنما نظر آئے، اس لیے معاشرتی بے مثال احکامات سے پہلے "لا تعبدون الا اللہ" کی بنیاد کو بیان کیا گیا، معلوم ہوا کہ سچی خداپرستی کے بغیر کسی بڑی خوبی تک حقیقی رسائی بہت مشکل ہے۔ عبادت کا لفظ بندگی، غلامی اور مکمل اطاعت کے لیے آتا ہے، جس میں پورے نظام کو من وعن تسلیم کر کے اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل سے یہ عہد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں لیا گیا، آج بھی موجودہ توریت کے بعض مقامات پر اس عہد کی شقیں نظر آتی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مختلف انبیاء علیہم السلام کے ادوار میں یہ عہد بار بار تازہ کیا جاتا رہا۔

وبالوالدین احسانا؛ کتاب وسنت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ورسول ﷺ کے حق کے بعد سب سے بڑا حق ماں باپ کا ہے، ہمارے خیال میں کسی شیخ پیر یا استاد کا بھی اتنا بڑا حق نہیں جتنا بڑا حق والدین کا ہے، متعدد مقامات پر قرآن نے اللہ کی عبادت کے معاً بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کو بیان کیا ہے۔

چونکہ والدین ہی اس کے وجود کا بظاہر ذریعہ بنے ہیں، اس لیے ان کا مقام سب سے بلند اوران کا حق خدا اور رسول (ﷺ) کے بعد سب سے بڑا ہے، شیخ واستاد کا مقام عنداللہ بھلے جس قدر بلند ہو، اور باپ معاشرہ کے لحاظ سے ایک معمولی مزدور ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس کا حق بڑا ہے، ماں باپ میں حسن سلوک کے لحاظ سے سب سے بڑا حق ماں کا ہے پھر باپ کا، البتہ باپ کسی بات کا حکم دے اور ماں اس کے برعکس کسی اور بات کا حکم دے اور فی الوقت ایک ہی حکم پر عمل ممکن ہو تو باپ کا حکم ماننے اور ماں کی بہت دل جوئی کرے، اس لیے کہ باپ باپ ہونے کے ساتھ ساتھ ماں کا شوہر بھی ہے، لہٰذا اس کے حکم کو مقدم رکھا جائے گا۔ واللہ اعلم

یہ بات بھی جان لینا مناسب ہے کہ ان کے حقوق کا تعلق وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے؛ حضرت ابوسعید الساعدی فرماتے ہیں؛ ایک دفعہ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، اچانک بنی سلمہ کے ایک شخص آئے اور کہنے لگے؛ یارسول اللہ! ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی کیا کوئی ایسی نیکی ہوسکتی ہے جو میں ان کے حق میں

کروں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں، ان کے حق میں دعاء کرنا، ان کے لیے استغفار کرتے رہنا، ان کے جانے کے بعد ان کے عہد کی تکمیل کرنا، رشتوں کو جوڑے رکھنا، یعنی صلہ رحمی کرنا، جو ان ہی کے ذریعہ جوڑے جاتے ہیں (یعنی اصل رشتہ یا باپ کی طرف سے ہوتا ہے یا پھر ماں کی طرف سے) ان کے دوست احباب کی عزت کرنا۔ بعض روایات میں یہ بھی اضافہ ہے کہ یہ سن کر اس شخص نے کہا؛ یارسول اللہ! یہ کتنی زیادہ (نیکیاں) ہیں اور کس قدر اچھی ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر اس پر عمل کرو۔ (ابوداؤد)

وبذی القربی؛ سے مراد رشتہ دار ہیں، ایک حدیث میں ہے: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں؛ میں نے رسول ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے؛ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: میں رحمٰن ہوں اور یہ (رشتہ داری) رحم ہے، میں نے اپنے نام کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اسے دیا ہے، جو اسے جوڑے گا میں بھی اسے جوڑوں گا، اور جو اسے کاٹے گا میں بھی اسے کاٹ کر الگ کر دوں گا۔

عربی میں رشتہ داری کو "رحـــم" کہتے ہیں، اور اللہ کا نام رحمٰن ہے، رحمٰن کے اصل حروف (ر ح م) "رحـم" میں پائے جاتے ہیں، گویا اللہ نے اپنے نام کا ایک حصہ رشتہ داری کو دے کر یہ واضح کر دیا کہ رشتہ کو جوڑنا اللہ کو کس قدر پسند ہے اور رشتہ کو توڑنا کتنا ناپسند۔ اس کی روشنی میں وہ لوگ غور کریں جو سرے سے رشتوں کا خیال ہی نہیں رکھتے اور وہ بھی غور فرمائیں جو ہر ایک کے ساتھ اچھے رہتے ہیں، برے ہوتے ہیں تو صرف اپنے رشتہ داروں کے لیے۔

الیتـــامی؛ "یتیم" اس نابالغ بچہ کو کہتے ہیں جس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہو، لفظ یتیم خود اس کی دعوت دیتا ہے کہ ایسے بچہ کو قریب کیا جائے، اسے تنہائی اور محرومی کا احساس نہ ہونے دیا جائے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے؛ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے، آپ نے شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا اور دونوں میں ہلکا سا فصل رکھا، یعنی ہم دونوں جنت میں ساتھ ساتھ رہیں گے۔

یتیم بچوں کی کفالت کے لیے یتیم خانوں کی تعمیر کے بجائے اگر ان بچوں کو خود ان کے اپنے گھروں ہی میں رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کی سچی فکر رکھی جائے تو شاید یہ زیادہ بہتر انداز ہوگا، دیانت کی کمی اور ہمدردی سے دوری نے یتیم خانوں کا کوئی اچھا نقشہ سامنے نہیں رکھا ہے، یہ کام اگر انفرادی طور پر ہمہ گیر سطح پر ہو تو شاید زیادہ مفید بنے، اور یتیم نونہالوں کی عزت نفس بھی اس سے مجروح نہیں ہوگی، مسلم معاشرہ اس پر غور کرے۔

والمساکین؛ ناداروں اور ضرورت مندوں کے لیے مسکین کا لفظ آتا ہے، یہ لفظ سکون سے بنا ہے، جس کا مطلب حرکت نہ کرنے کا ہے، گویا حالات نے ان کو ایسا بنا دیا ہے کہ بے چارے بالکل بے حال ہو کر رہ گئے ہوں، ایسے لوگوں پر توجہ کرنا اور ان کی خیر خبر رکھنا مسلم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز پڑھنا فرض ہے، قرآن کریم نے نہ صرف ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے بلکہ مسکین کی بھوک مٹانے کے لیے ایک دوسرے کو آمادہ نہ کرنے کے عمل کو کافروں کا عمل قرار دے کر اسے تقریباً کفر کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے؛ بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے، راوی کہتے ہیں؛ مجھے یہ خیال آتا ہے کہ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: یہ اس نمازی کی طرح ہے جو اپنی نمازوں سے تھکتا نہیں اور ایسے روزہ دار کی طرح ہے جو کبھی بغیر روزہ کے نہیں رہتا۔

وقولوا للناس حسنا؛ مخصوص طبقات کو بیان کرنے کے بعد اب کل انسانیت کے ساتھ حسن سلوک کا درس دیا جا رہا ہے، قرآن کریم کا پیغام عالمی ہے، بنی اسرائیل کو بھی یہی حکم تھا کہ تمام لوگوں کے ساتھ اچھے انداز سے پیش آئیں، اس سلسلہ میں اپنوں اور غیروں کے درمیان کوئی فرق نہ کریں، توریت میں ہے؛ "اگر کوئی پردیسی تیرے ساتھ تمہارے ملک میں بود و باش کرتا ہو تو تم اسے آزار نہ پہنچانا، بلکہ جو پردیسی تمہارے ساتھ رہتا ہے اسے دیسی کی مانند سمجھنا، بلکہ تو اس سے اپنی مانند محبت کرنا اس لیے کہ تم ملک مصر میں پردیسی تھے"۔ (احبار: ۱۹/۳۳)

وأقیموا الصلاۃ وآتوا الزکاۃ؛ نماز اور زکاۃ کا حکم تقریباً تمام انبیاء اور ان کی قوموں کو دیا گیا ہے، البتہ اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں، بنی اسرائیل کو بھی اس کا حکم تھا، توریت میں جا بجا اللہ کی پرستش کرنے کا جو ذکر ہے، اس کی ظاہری شکل بظاہر نماز ہی ہوگی

.....(باقی صفحہ نمبر/۱۶ پر)

احکام قربانی

مفتی راشد حسین ندوی

قربانی کے جانور:

قربانی تین جنس کے جانوروں کی جائز ہے:

(۱) بھیڑ بکری، خواہ نر ہو یا مادہ، اور بکرا خواہ خصی ہو یا غیر خصی، اس لیے کہ احادیث میں خصی غیر خصی سب کی قربانی کرنے کا ذکر ہے۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، مسند احمد وغیرہ)

اور اس جنس کا کوئی بھی جانور ہو، اس کو صرف ایک شخص کی طرف سے ذبح کیا جاسکتا ہے۔

(۲) گائے بیل اور بھینس وغیرہ، خواہ نر ہو یا مادہ، اس جنس کی قربانی سات افراد کی طرف سے ہوسکتی ہے، بشرطیکہ ساتوں برابر برابر رقم لگائیں اور کسی کا حصہ ساتویں حصہ سے کم نہ ہو، احادیث میں اصلاً گائے کا ذکر ہے، لیکن فقہاء نے بھینس کو بھی اس میں شامل قرار دیا ہے، اس لیے کہ بھینس بھی جنسی لحاظ سے گائے کے ہی قبیلہ سے سائنسی طور پر تعلق رکھتی ہے، اور زکوۃ وغیرہ کے مسائل میں بالاتفاق دونوں کو ایک قرار دیا گیا ہے، لہٰذا یہاں کے حالات کے پیش نظر اس کی قربانی کرائی جاسکتی ہے، اور گائے کی قربانی پر چونکہ سخت پابندی ہے، اور اس کی قربانی سے فساد کا بھی اندیشہ رہتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو اس کی قربانی اور ذبیحہ سے مکمل احتراز کرنا چاہیے، مسلم اور ابوداؤد کی روایت میں صراحت ہے کہ اس جنس میں سات افراد شریک ہوسکتے ہیں۔

(۳) اونٹ خواہ عربی یا بختی نر ہو یا مادہ، حدیث کی صراحت کے مطابق اس میں بھی سات افراد شریک ہوسکتے ہیں۔

(مسلم، ابوداؤد، ہندیہ: ۵/۲۹۷، شامی: ۵/۲۲۲)

ان جانوروں کی عمریں:

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم لوگ صرف مسنہ (ثنی) کی قربانی کیا کرو، الا یہ کہ تم پر دشواری ہو جائے تو دنبہ اور بھیڑ کا چھ ماہ کا جانور ذبح کرلیا کرو۔ (مسلم)

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ صرف مسنہ کی قربانی جائز ہے، لیکن ہر جنس کا مسنہ (ثنی) الگ ہوتا ہے، چنانچہ اس میں مندرجہ ذیل تفصیلات ہیں:

(۱) بکرا اور بکری میں مسنہ اس کو کہتے ہیں جس کے ایک سال مکمل ہوچکے ہوں، اور دوسرا سال شروع ہوگیا ہو، یہی تفصیل بھیڑ اور دنبہ میں بھی ہوتی، لیکن نبی کریم ﷺ نے اس میں چھوٹ بتائی ہے، لہٰذا بھیڑ اور دنبہ اگر چھ ماہ سے اوپر کا ہو اور دیکھنے میں سال بھر کا معلوم ہوتا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے، لیکن یہ چھوٹ بکرے وغیرہ میں نہیں ہے۔

(۲) گائے بھینس میں مسنہ اس کو کہتے ہیں جو دو سال مکمل کرچکا ہو اور تیسرا سال لگ گیا ہو۔

(۳) اونٹ میں مسنہ وہ ہے جو پانچ سال مکمل کرچکا ہو۔

(بدائع: ۴/۲۰۶، شامی: ۵/۲۲۶، ہندیہ: ۵/۲۹۷)

اوپر جو عمریں بتائی گئی ہیں ان سے ایک دن بھی کم عمر کا ہو تو قربانی جائز نہیں ہے، اگر بتائی گئی عمر سے زیادہ عمر کا جانور ہو تو اس کی قربانی صحیح ہے۔ (ایضا)

فروخت کرنے والے کی بات کا اعتبار:

اگر جانور گھر کا ہے یا کسی واقف کار کا ہے، تب تو عمر کا پتہ لگانا آسان ہے، لیکن اگر اجنبی شخص سے جانور لیا جارہا ہے، وہ جو عمر بتارہا ہے، اس کے لحاظ سے جانور قربانی کے لائق ہوگیا ہے، تو اگر جانور اس کی بتائی ہوئی عمر کا لگ رہا ہو اور بظاہر وہ سچ بول رہا ہو تو اس کی بات پر شرعاً اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ (جواہر الفقہ: ۱/۴۴۹)

جب جانور گم ہوجائے:

اگر کسی نے قربانی کی نیت سے جانور رکھا، لیکن قربانی سے پہلے ہی وہ جانور گم ہوگیا تو اگر اس پر قربانی واجب تھی تو اس کی جگہ دوسرا جانور خریدے یا کم از کم حصہ لے، لیکن اگر کسی پر قربانی واجب نہیں تھی اور اس کے ساتھ یہی بات پیش آئے تو اس پر دوسرا جانور خرید کر قربانی کرنا واجب نہیں ہوگا، امیر اور غریب کے احکام میں یہی فرق اس وقت بھی رہے گا جب قربانی کا جانور مرجائے۔

(بدائع: ۴/۲۱۶، ہندیہ: ۵/۲۹۹، شامی: ۵/۲۲۹)

اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر کے اوپر غیر متعین طور پر ایک جانور کی قربانی واجب ہے، جب کہ فقیر کے اوپر وجوب خریداری یا تعیین کی وجہ سے اسی متعین جانور کا ہوتا ہے، اسی لیے اس میں مسئلہ یہ ہے کہ

امیر نے ایک جانور خریدا اور وہ گم ہوگیا، لہٰذا اس نے دوسرا خریدا تو اب اسے اختیار ہے کہ دونوں میں سے جس کی چاہے قربانی کرے، اس لیے کہ اس پر غیر متعین طور سے ایک جانور کی قربانی واجب ہے اور اگر فقیر نے ایک جانور خریدا اور وہ گم ہوگیا تو جیسا کہ بتایا گیا اب اس پر دوبارہ خریدنا واجب نہیں ہے لیکن اگر اس نے دوسرا جانور خرید لیا پھر پہلا جانور بھی مل گیا تو دونوں جانوروں کی قربانی واجب ہوجائے گی، اس لیے کہ قربانی کی نیت سے خریدنے کے سبب ایک طرح سے دونوں کی قربانی کی نذر ہوگئی ہے۔ (شامی:۵/۲۲۹)

نابالغ و مجنون کی طرف سے قربانی:

نابالغ یا مجنون کی طرف سے ان کے والد وغیرہ پر قربانی کرنا واجب نہیں ہے، اس معاملہ میں قربانی کا حکم صدقہ فطر سے الگ ہے، اور اگر نابالغ اور مجنون کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ صاحب نصاب ہوں تو ان پر قربانی ہوگی یا نہیں، اس میں کئی اقوال ہیں، اصح یہ ہے کہ اس صورت میں بھی ان پر قربانی واجب نہیں ہے، لیکن اگر احتیاطاً کردیا جائے تو بہتر ہوگا۔ (ہندیہ:۵/۲۹۳)

گھر والوں کی طرف سے بلا اجازت قربانی:

اگر دوسرے کی طرف سے اس کی اجازت کے بغیر قربانی کی جائے تو اس کا واجب ادا نہیں ہوگا، لہٰذا اس اصول کے اعتبار سے بیوی یا بالغ اولاد کی طرف سے قربانی کی تو واجب ادا نہ ہوگا، البتہ اگر گھر مشترک ہو اور صراحۃً اجازت تو نہ ہو لیکن عرف کے اعتبار سے اجازت ہو تو قربانی کا وجوب ادا ہوجائے گا۔

(ہندیہ:۵/۳۰۲، شامی:۵/۲۲۲)

مرحومین کی طرف سے قربانی:

اگر کوئی شخص اپنے مرحوم رشتہ داروں کے ایصال ثواب کے لیے قربانی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص آپ ﷺ کی طرف سے نفلی قربانی کرے تب بھی جائز ہے، اگر بڑے جانوروں میں چھ لوگ شریک ہوں، اور سب مل کر ایک حصہ آپ ﷺ کے نام سے کریں تب بھی کوئی حرج نہیں ہے، اس طرح سے جب کسی کی وصیت کے بغیر قربانی کی تو قربانی کا گوشت اسی طرح سب لوگ استعمال کرسکتے ہیں جیسے اپنے نام سے قربانی کرنے پر سب استعمال کرسکتے ہیں۔ (شامی:۵/۲۲۹-۲۳۶)

لیکن اگر کسی نے قربانی کرنے کی وصیت کی اور اس کے لیے مال بھی چھوڑا تو اس کی وصیت نافذ کی جائے گی اور پورا گوشت فقراء پر صدقہ کرنا ہوگا، اس کو مالدار لوگ استعمال نہیں کرسکتے۔ (ایضا)

قربانی کی قضاء:

اگر کسی پر قربانی واجب تھی لیکن وہ ایام قربانی میں کسی وجہ سے قربانی نہ کرسکا تو اگر جانور خرید لیا تھا تو چاہے تو اس جانور کو صدقہ کردے اور چاہے تو اس کی قیمت صدقہ کردے، اگر جانور نہیں خریدا تھا تو ایام قربانی گزرنے کے بعد ایک بکرے کی قیمت صدقہ کرنا واجب ہے، بڑے جانور کے ساتویں حصہ کی قیمت صدقہ کرنے سے واجب ادا نہ ہوگا۔ (ہندیہ:۵/۲۹۴، شامی:۵/۲۲۶)

قربانی کی نذر:

اگر کسی نے قربانی کی نذر مانی تھی، خواہ اس طرح کہ میں اپنے اوپر اللہ کے لیے قربانی لازم کرتا ہوں اور خواہ اس طرح کہ فلاں کام ہوگیا تو قربانی کراؤں گا، تو قربانی اس پر واجب ہوجائے گی اور پھر اس پورے گوشت کا صدقہ کرنا لازم ہوگا، خود نہیں کھاسکتا۔

(شامی:۵/۲۲۵)

جانور کیسا ہونا چاہیے:

جہاں تک ممکن ہو صحت منداور عیوب سے خالی جانور کی قربانی کرانا چاہیے، لیکن اچھے جانور کی قربانی میں نیت بھی اچھی ہونی چاہیے، مقصد ہرگز یہ نہ ہونا چاہیے کہ قیمتی جانور کی قربانی کریں گے تو نام ہوگا، ورنہ بدنیتی کی وجہ سے ثواب سے محرومی رہے گی، اس لیے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں صراحت سے آیا ہے۔

عیب دار جانور کی قربانی سے احادیث میں صراحت سے روکا گیا ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ آنکھ کان دیکھ لیا کریں (کہ اس میں کوئی عیب تو نہیں ہے)

(ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

اور حضرت براء بن عازب سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کس طرح کے جانور کی قربانی سے بچنا چاہیے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: چار سے، اس لنگڑے سے جس کا لنگ واضح ہو، اس یک چشم سے جس کی یک چشمی واضح ہو، اس بیمار سے جس کی

بیماری واضح ہو اور اس لاغر سے جس کی ہڈیوں میں گودا نہ بچا ہو۔
(مؤطا، ترمذی، مسند احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

ان احادیث کے پیش نظر فقہاء نے عیوب کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل تفصیلات بیان کی ہیں:

۱- جس جانور کی سینگ ٹوٹ گئی ہو یا جس کے پیدائشی طور پر سینگ نہ ہوں، اس کی قربانی جائز ہے، لیکن اگر سینگ جڑ تک اس طرح ٹوٹ گئی کہ دماغ کی ہڈی میں سوراخ ہو گیا تو اس کی قربانی جائز نہیں۔ (شامی: ۵/ ۲۲۷، بدائع: ۴/ ۲۱۶)

۲- بدھیا بکرے کی قربانی نہ صرف جائز بلکہ افضل ہے، اس لیے کہ ابوداؤد، مسند احمد وغیرہ کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے خود اس طرح کے جانور کی قربانی کی ہے، پاگل جانور اگر گھاس اور چارہ کھاتا ہو تو اس کی قربانی کی جاسکتی ہے، ورنہ نہیں۔
(شامی: ۵/ ۲۲۷)

۳- اندھے، کانے اور بالکل لاغر جانور کی قربانی جائز نہیں، اسی طرح جو جانور کسی بیماری کا شکار ہو اور بیماری واضح ہو تو اس کی قربانی بھی صحیح نہیں ہے، اور جو جانور لنگڑا ہو، اگر وہ متاثر پیر زمین پر رکھتا ہی نہ ہو تو اس کی قربانی بھی صحیح نہیں ہے، اگر اس کو بھی زمین پر ٹیکتا ہو تو اس کی قربانی صحیح ہے۔ (ایضا)

۴- جس جانور کا تہائی سے زیادہ کان یا دم یا تھن کٹا ہوا ہو یا سوکھ گیا ہو، مثلاً بکری کا ایک اور بھینس وغیرہ کے دو تھن تو اس کی قربانی صحیح نہیں ہے، جس جانور کے پیدائشی طور پر کان نہ ہوں، اس کی قربانی بھی صحیح نہیں ہے، اسی طرح جس جانور کے تمام یا اکثر دانت ٹوٹ گئے ہوں، اس کی قربانی بھی جائز نہیں ہے۔ (ایضا)

۵- جو جانور نہ نر ہو نہ مادہ، اس کی قربانی بھی جائز نہیں۔
(ہندیہ: ۵/ ۲۹۹)

بقیہ: بنی اسرائیل سے عہد وپیمان

.....اسی طرح محتاجوں اور مسکینوں، بیواؤں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم بھی، شاید زکاۃ کی بھی خاص شکل ہوگی، بعض مستقل ابواب توریت میں اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی سے متعلق ہیں، یہ بھی جانوروں کی زکاۃ ہی کی ایک مخصوص صورت معلوم ہوتی ہے۔

ثم تولیتم؛ پھر تم نے روگردانی کی، یہ سلسلہ موسیٰ علیہ السلام کے دور ہی میں گوسالہ پرستی کی شکل میں کچھ شروع ہو گیا تھا، اللہ نے ان کو معاف فرمایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون کے دور میں ان کو اپنی آبائی زمین نصیب ہوئی، یہ زمین پوری ترتیب کے ساتھ حضرت یوشع نے تمام اسرائیلی قبائل اور ان کی شاخوں میں تقسیم فرمائی۔ (یشوع: باب ۱۴ تا ۲۱)

بنی اسرائیل میں شرک و بت پرستی کا سلسلہ وقتاً فوقتاً چلتا رہا، اللہ کی طرف سے مار پڑتی رہی، جب مار پڑتی اور کسی قوم کے ہتھے چڑھ جاتے تو خوب گڑگڑاتے، پھر جب اللہ کا فضل واحسان ہوتا تو کچھ مدت بعد پھر وہی حماقت سرزد ہوتی، اللہ کی طرف سے انبیاء اور رہنما جن کو عہد قدیم میں قاضی کہا گیا ہے مقرر ہوتے رہے، ان کی سربراہی میں وہ کچھ ٹھیک رہتے لیکن جیسے ہی ان کا انتقال ہوتا پھر بت پرستی کی طرف چل دیتے، بلکہ بسا اوقات ان رہنماؤں کی موجودگی میں بھی اس طرح کی حرکتیں کی گئیں۔

البتہ اس پوری مدت میں بنی اسرائیل متحد تھے اور آپس میں خونریزی نہیں کی، بنی اسرائیل میں اولین باہمی خونریزی بن یمین کی اولاد اور بقیہ اسرائیلیوں میں ہوئی جس میں ہزاروں لوگ قتل ہوئے۔

بنی اسرائیل میں دوسری باہمی خونریزی حضرت یوشع علیہ السلام کی وفات کے بہت مدت بعد ہوئی، یہ زمانہ غالباً حضرت یوشع وحضرت سموئیل کا درمیانی زمانہ تھا۔

الا قلیلا منکم و أنتم معرضون؛ جب "اعراض" اور "تولی" دونوں ساتھ میں آئیں تو "اعراض" کا مطلب دل سے تسلیم نہ کرنا اور "تولی" کا مطلب عملاً رخ پھیرنے کا ہوتا ہے، اس سے قبل خود "عہد نامہ قدیم" کے حوالہ سے بنی اسرائیل کے یہ امراض کھول کر بیان کیے جاچکے ہیں، احکام خداوندی سے روگردانی کی ان کی یہ عادت صدیوں تک چلتی رہی، جب مار پڑتی تو کچھ سدھر جاتے لیکن بعد میں وہ پھر اپنی اسی پرانی روش پر لوٹ آتے جس کے نتیجہ میں غضب الٰہی کا شکار بنتے۔

محرم الحرام کی بدعات

ادارہ

غم کا مہینہ سمجھنا: آپ ﷺ نے یہ بات صاف طور پر ارشاد فرمادی ہے:"لَا تُحِدُّ عَلیٰ مَیِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثٍ إِلَّا الْمَرْأَۃُ تُحِدُّ عَلیٰ زَوْجِھَا أَرْبَعَۃَ أَشْھُرٍ وَ عَشْراً" (تم کسی میت پر تین دن سے زیادہ غم نہ مناؤ، سوائے عورت کے کہ وہ اپنے شوہر پر چار مہینہ دس دن تک سوگ منائے گی)

تعزیہ داری: شیعوں کی مذہبی کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ لکھا ہے:"جو شخص کسی قبر کو پھر سے بنائے یا اس کی شکل وشبیہ (تعزیہ) بنائے تو وہ اسلام سے خارج ہے"۔

ماتم و نوحہ: نبی اکرم ﷺ نے کھلے لفظوں فرمایا: "لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُیُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَی الْجَاھِلِیَّۃِ" (وہ شخص ہم میں سے نہیں جو چہروں کو پیٹے، گریبان کو پھاڑے اور جاہلیت کی طرح واویلا مچائے)

مرثیہ خوانی: ابن ماجہ کی روایت ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"نَھَی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمَرَاثِیْ" (نبی ﷺ نے مردہ کے محاسن بیان کرکے رونے سے منع فرمایا)

سیاہ لباس: کتاب "عیون الأخبار" میں حضرت علیؓ کا یہ قول مذکور ہے:"میرے دشمنوں کا لباس نہ پہنا کرو، حضور ﷺ کے دشمنوں کا لباس سیاہ ہے"۔

ڈھول تاشہ: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا::"اَلْغِنَاءُ یُنْبِتُ النِّفَاقَ فِیْ الْقَلْبِ" (گانا بجانا دل میں نفاق کا بیج بودیتا ہے)

ایصال ثواب: حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مخصوص ایام میں ایصال ثواب کے متعلق لکھتے ہیں:"انسان کو اختیار ہے کہ اپنے عمل کا ثواب بزرگوں کو پہنچائے، لیکن اس کام کے لیے کوئی وقت، دن اور مہینہ مقرر کرنا بدعت ہے"۔

مجالس کا انعقاد: علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ "جامع الرموز" کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:"اگر قتل حسینؓ کے تذکرہ کا ارادہ ہو تو اس سے پہلے تمام صحابہ کی شہادت کا ذکر ہونا چاہیے تاکہ روافض کے ساتھ مشابہت نہ رہے"۔

سبیل لگانا: حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ لکھتے ہیں:"محرم میں ذکر شہادت حسین علیہ السلام کرنا اگرچہ روایات صحیحہ ہو، یا سبیل لگانا یا شربت پلانا، یا چندہ سبیل یا شربت میں دینا، یا دودھ پلانا سب نادرست اور تشبہ روافض کی وجہ سے حرام ہے"۔

کھچڑا پکانا: کھچڑا پکانا کا خوارج ونواصب کی علامت ہے جو حضرت حسینؓ کی شہادت کے دن اپنی خوشی کے اظہار کے لیے پکاتے تھے، مشہور کتاب "البدایہ والنہایہ" میں لکھا ہے:"شام کے رہنے والے ناصبی لوگوں نے روافض وشیعہ حضرات کی مخالفت کی، اسی لیے وہ عاشوراء کے دن مختلف قسم کے غلوں کا پکوان بناتے تھے، اور عمدہ کپڑے زیب تن کرتے تھے، اس دن کو عید کی طرح مناتے تھے، اسی لیے اس دن قسم قسم کے کھانے تیار کرتے تھے، جس سے وہ اپنی خوشی ومسرت کا اظہار کرتے تھے"۔

زیب وزینت ترک کرنا: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس ماہ میں زیب وزینت ترک کرنے کے متعلق رقم طراز ہیں:"ان ایام میں قصداً زینت ترک کرنا جس کو سوگ کہتے ہیں، اور حکم اس کا شریعت میں یہ ہے کہ عورت کو صرف خاوند پر چار ماہ دس دن یا وضع حمل تک واجب ہے اور دوسرے عزیزوں کے مرنے پر تین دن جائز ہے باقی حرام، سو اب تیرہ سو سال کے بعد یہ عمل کرنا بلاشک حرام ہے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ملک شام کا دوسرا سفر

محمد ارمغان بدایونی ندوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک شام کا دوسرا سفر پچیس سال کی عمر میں کیا اور یہ سفر بحیثیت ایک کامیاب تاجر کی شکل میں تھا، بارہ سال کی عمر میں کیے گئے تاریخی سفر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیرون ملک یہ دوسرا سفر تھا۔ اس مدت میں مختلف دلچسپ واقعات بھی پیش آئے جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اہل مکہ کے لیے مزید نفع بخش ثابت ہوگئی تھی۔ تاہم اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شغل تجارت کو مقامی اعتبار سے جاری رکھا، اور عرب کے مشہور بازاروں میں شرکت بھی فرمائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مدت میں سماجی اختلاط سے کئی چیزیں واضح ہوگئی تھیں، یعنی آپ کی امانت داری، پاس وفا، صدق گوئی، حلم وفضل، تواضع وسخاوت۔ یہی وجہ تھی کہ مکہ کے لوگ کم عمری ہی میں آپ کو ''صادق'' و ''امین'' لقب سے پکارنے لگے تھے، اور انہیں خصائل حمیدہ اور بحیرا راہب کے تاثراتی کلمات کے پیش نظر ابوطالب کو بھی یقین تھا کہ ان کے بھتیجے کی شان سب سے نرالی ہے، اور کسی کی گزند انہیں کوئی نقصان پہنچانے والی نہیں ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس برس کی ہوئی تو شفیق چچا نے محبوب بھتیجے کی عظمت کا آفتاب عروج پر دیکھا، اور ان کی ہنرمندی کا اقرار زبان زد خاص وعام پایا، اور دوسری طرف اپنی غربت ومفلسی پر بھی نظر ڈالی، جس کے بعد یہ خیال ہوا کہ بھتیجے کو قریش کے قافلہ کے ساتھ ملک شام تجارتی سفر پر روانہ کردیا جائے، پروردگار نے ان کے ہاتھ میں بڑی برکت رکھی ہے، لیکن مال کی اتنی فراوانی نہ تھی کہ تجارت کی جاسکے، اسی لیے شریف ونجیب بھتیجے سے مشورہ کیا اور کہا: بھتیجے! میں ایک مفلس شخص ہوں اور مجھ پر زمانہ کی ستم ظریفی تمہارے سامنے عیاں ہے، مکہ کی قحط سالی نے جو ہمارا برا حال کیا ہے، اس سے بھی تم بخوبی واقف ہو، نہ ہمارے پاس کوئی ذریعۂ معاش ہے اور نہ ہی وسائل تجارت اور اب قریش کے قافلہ کا شام روانہ ہونے کا وقت آچکا ہے، اور اس قافلہ میں ہر سال خدیجہ بنت خویلد کا مال بھی ''مضاربت'' پر جاتا ہے، جس کا منافع سب سے زیادہ ہوتا ہے، میرا خیال ہے کہ اگر تم حضرت خدیجہ کے سامنے اپنی اس ضرورت کو بیان کرو اور ان کا مال تجارت لے کر ملک شام کا سفر کرو تو بہت بہتر ہو، اور مجھے قوی امید ہے کہ حضرت خدیجہ تمہاری بات کو ہرگز نہیں ٹالیں گی، اور وہ ہر حال میں تمہیں ترجیح دیں گی، گرچہ مجھے تمہیں ملک شام بھیجنا بالکل اچھا نہیں لگتا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی حل بھی نہیں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے محبوب چچا کی یہ رائے بہت پسند آئی، مگر غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ حضرت خدیجہ تک اپنے اس ارادے کو درخواست کی صورت میں پیش کریں اور نہ ہی خدا تعالیٰ کی جانب سے اس کا موقع دیا گیا، بلکہ جیسے ہی حضرت خدیجہ کو کسی خفیہ ذریعہ سے چچا بھتیجے کے اس مشورہ کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً اپنی جانب سے مضاربت پر مال لے جانے کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست فرمائی جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بخوشی قبول فرمایا، چونکہ حضرت خدیجہ مکہ مکرمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ کے چرچے سن چکی تھیں، اس لیے انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس سے زیادہ مال عطا کروں گی جو دوسروں کو دیتی ہوں، اور ساتھ ہی بطور معاون و خادم اپنے غلام میسرہ کو بھی روانہ کیا۔

قریش کا یہ مبارک تجارتی قافلہ چند ہی روز میں ملک شام پہنچ گیا، اور بصریٰ کی تجارتی منڈی کے قریب خیمہ زن ہوا، اسی علاقہ میں ایک مسیحی راہب کی خانقاہ تھی، جس کا نام نسطورا تھا، شاید یہ وہی خانقاہ تھی جس میں تیرہ سال قبل بحیرا راہب سے ملاقات ہوئی تھی، اور اب اس میں نسطورا نامی راہب مقیم تھا، اس راہب نے اپنی خانقاہ سے دیکھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک تاریخی درخت کے نیچے آرام فرما ہیں، اس درخت کے متعلق نسطورا کو مسیحی روایات کی روشنی میں علم تھا کہ اس کے نیچے نبی ہی قیام کرسکتا ہے، چنانچہ نسطورا فرط جذبات میں اپنی

خانقاہ سے باہر آیا اور میسرہ سے حضور ﷺ کے متعلق دریافت کیا، (نسطورا راہب میسرہ کو پہلے ہی سے جانتا تھا، ممکن ہے کہ میسرہ حضرت خدیجہ کے مال تجارت کی نگہبانی کے بطور پہلے بھی آتے رہے ہوں) میسرہ نے حضور ﷺ کا جامع تعارف کرایا اور اثنائے سفر خرق عادت پیش آنے والے واقعات کا بھی ذکر کیا، نسطورا نے معلوم کیا کہ کیا ان کی آنکھوں میں کچھ سرخی بھی ہے؟ میسرہ نے جواب دیا: ہاں! ہمیشہ رہنے والی سرخی ہے، یہ جواب سن کر راہب نے برملا اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ یہ وہی ہے، یہی آخری نبی ہے، کاش مجھے اس کا زمانہ نصیب ہوتا۔ میسرہ کے ذہن و دماغ پر راہب کی یہ باتیں نقش ہوگئیں۔

سفر کی تھکاوٹ دور ہوئی تو قافلہ شغل تجارت میں مشغول ہوگیا، اور آپ ﷺ نے کثیر مقدار میں مال کو بہت ہی قلیل مدت میں فروخت کردیا، اور آپ کو غیر معمولی منفعت بھی حاصل ہوئی۔ انہیں ایام کی بات ہے کہ ایک روز بصریٰ کی منڈی میں مال تجارت فروخت کرتے وقت کسی شخص سے بھاؤ تاؤ میں کوئی اختلاف ہوگیا، جس پر وہ شخص آگ بگولہ ہوکر لات وعزی کی قسمیں کھانے لگا اور حضور ﷺ سے بھی ان جھوٹے معبودوں کی قسم کھانے کو کہنے لگا، اس پر آپ ﷺ نے انتہائی جرأت مندانہ لہجہ میں یوں خطاب کیا: ”میں نے ان دونوں کی کبھی قسم نہیں کھائی اور میں ان دونوں کے پاس سے جب گزرتا ہوں تو ان کو نظر انداز کردیتا ہوں۔“

حضور ﷺ کی متانت، حق گوئی و بے باکی دیکھ کر اس شخص نے کہا: آپ بالکل درست بات کہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بات سوائے نبی کے کوئی نہیں کہہ سکتا۔

چند روز میں جب قافلہ اپنے مقصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہوگیا، تو تجارتی قافلہ نے مکہ کا کوچ کیا، یہاں اہل مکہ اس قافلہ کی واپسی کے شدت سے منتظر تھے، چنانچہ جب قافلہ مکہ پہنچا تو حضرت خدیجہ اپنے بالاخانے سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس خوبصورت منظر کا نظارہ کررہی تھیں، اسی نظارہ میں انہوں نے ایک انوکھا مشاہدہ یہ بھی کیا کہ دو فرشتے ہیں جو آپ ﷺ پر سایہ فگن ہیں، حضرت خدیجہ نے یہ فرحت بخش منظر اپنی سہیلیوں کو بھی دکھایا اور ہر ایک یہ منظر دیکھ کر محو حیرت رہ گیا۔

حضور اکرم ﷺ نے سفر سے واپسی میں مکہ داخل ہوتے ہی سیدھے حضرت خدیجہ کے گھر کا قصد کیا اور اس سفر میں جو غیر معمولی نفع حاصل ہوا تھا، اس تمام منافع کا حساب دیا، پھر اپنے گھر واپس ہوئے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آپ کا یہ نیک عمل اور آپ کی محنت و برکت سے مال تجارت کی منفعت بہت پسند آئی۔

جب یہ مبارک سفر ختم ہوا اور لوگ اپنی اپنی منزلوں پر پہنچ گئے تو میسرہ نے اپنے ذاتی مشاہدات و تاثرات حضرت خدیجہ کو گوش گذار کرائے، انہوں نے کہا: میں نے سفر کے دوران محمد (ﷺ) کے ساتھ بہت سے خرق عادت واقعات پیش آتے دیکھے، میں نے دیکھا کہ جب آپ (ﷺ) تیز دھوپ میں چلتے تھے تو دو فرشتے آپ پر سایہ فگن ہوجاتے تھے، اور جب ہم بصریٰ کی منڈی میں اترے تو وہاں نسطورا راہب نے ان کے متعلق بڑی حیرت انگیز باتیں بیان کیں اور جب ہم سامان تجارت فروخت کررہے تھے تو حضور ﷺ نے لات وعزی کی قسم کھانے سے انکار کردیا۔

یہ سننے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک آپ ﷺ کی نافعیت دو دوچار کی طرح واضح ہوچکی تھی، اور آپ کی صالحیت وصلاحیت دل میں گھر کرگئی تھی، چنانچہ یہی سب اسباب آپ ﷺ کے عقد اول کی تمہید ثابت ہوئے، اور اسی سفر شام کے چند مہینوں بعد آپ ﷺ کا تاریخ ساز عقد حضرت خدیجہ سے ہوا۔

حافظ ابن مندہ نے ایک ضعیف سند سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے بیس سال کی عمر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملک شام کا تجارتی سفر کیا تھا، اور اس میں حضرت ابوبکرؓ کی بحیرا راہب سے ملاقات بھی ہوئی تھی، لیکن یہ سفر کس نوعیت کا تھا اور کس کا مال تجارت ساتھ تھا؟ اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، اور نہ ہی دیگر اصحاب سیر نے اس سفر کو اپنا موضوع بنایا ہے، علامہ حلبیؒ کا اس کے متعلق بیان ہے: ”أَقُوْلُ وَهِيَ سَفْرَتُهُ مَعَ مَيْسَرَةَ غُلَامُ خَدِيْجَةَ فَإِنَّهُ لَمْ يَثْبُتْ أَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَافَرَ إِلَى الشَّامِ أَكْثَرَ مِنْ مَرَّتَيْنِ“ (میری رائے ہے کہ اس سفر سے مراد وہی سفر ہے جس میں حضرت خدیجہ کے غلام میسرہ ساتھ تھے، اس لیے کہ حضور ﷺ کا سفر شام دو مرتبہ سے زیادہ ثابت نہیں ہے۔)

(السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۱۹۸)

حالات حاضرہ اور مسلمان

محمد نفیس خاں ندوی

مسلمانوں کے خلاف ملکی اور عالمی پیمانہ پر جو جنگ جاری ہے وہ نفسیاتی اور شعوری جنگ ہے، یہ جنگ اعصابی بلکہ سرد جنگ سے بھی زیادہ خطرناک ومہلک ہے، مسلم دشمن طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کو ایک ایسے سانچہ میں ڈھالنا چاہتی ہیں جو ان کے تصور اور نظریہ کے موافق ہو، چنانچہ عالمی سطح پر ایک ایسی سیاسی بساط بچھائی گئی اور سارے مہرے اس چالاکی سے بٹھائے گئے کہ حالات خود بخود مسلمانوں کے خلاف ہوتے جارہے ہیں، اور مسلمان شعوری وغیر شعوری طور پر اپنی ''مسلمانیت'' سے خوف محسوس کرنے لگا ہے۔

ماضی میں مسلمانوں پر مظالم کے مختلف طریقے ایجاد کیے جاچکے ہیں، لیکن گذشتہ چند سالوں میں ہندوستان میں ایک نیا طریقہ ظلم رائج ہوا ہے جسے '' موب لنچنگ '' کا نام دیا گیا ہے، ایک منظم بھیڑ کسی نہتے اور کمزور مسلمان کو نشانہ بناتی ہے، پھر مارتے پیٹتے اس کی جان تک لے لیتی ہے، اسی پر بس نہیں، اس گھنونے فعل کی ویڈیو رکارڈنگ کی جاتی ہے اور پھر مختلف دھمکی آمیز حاشیوں کے ساتھ اس کی تشہیر کی جاتی ہے، مقصد صرف مسلمانوں کی غیرت وحمیت کو ختم کرنا اور ان کی قوت برداشت کو پرکھنا ہوتا ہے۔

آزادئ ہند کے بعد سے ملک کے مختلف علاقوں میں بیشمار ہمالیائی فسادات ہوئے، بابری مسجد کی شہادت ہوئی، سخت جانی ومالی نقصانات ہوئے، گجرات فسادات نے تو حیوانیت کی ساری حدیں ہی پار کردیں، دلائل وثبوت گواہ ہیں کہ یہ سارے فسادات نہایت منظم اور سرکار کی پشت پناہی میں ہی ہوئے جو یقیناً ہندستان کی پیشانی پر بدنما داغ ہیں تاہم یہ فسادات وقتی تھے اور ملک کے خاص خاص علاقوں میں واقع ہوئے تھے، اس لیے جلد ہی مسلم قوم ان صدموں سے باہر نکل آئی، جانی ومالی نقصانات کا جائزہ لیا اور اپنے ملی تشخص کے ساتھ ترقی کی جانب نئے سفر کا آغاز کیا۔

لیکن موجودہ صورتحال پہلے کے مقابل زیادہ سنگین اور تشویشناک ہے، اس وقت فرقہ واریت، تشدد پسندی اور نفرت کی سیاست کو مذہب کے نام پر نہ صرف فروغ دیا جارہا ہے بلکہ لوگوں کے مزاجوں میں بھی داخل کیا جارہا ہے، جس کے لیے جارحیت پسند تنظیمیں پوری آزادی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں، ایسے میں ملک کا کوئی خطہ اور کوئی طبقہ محفوظ نہیں ہے، اقلیتیں پریشان اور مسلم قوم سخت مرعوبیت اور تشویش میں مبتلا ہے، اور اپنے مستقبل کو لے کر اضطراب کا شکار ہے۔ بلاشبہ اس کیفیت کا پیدا ہونا طبعی اور فطری ہے لیکن کسی بھی صورت میں مایوس ہونا اور ٹھوس لائحہ عمل سے غفلت برتنا اہل ایمان کے شایان شان نہیں۔

حالات کا تجزیہ بتلاتا ہے کہ اس تشویشناک صورتحال کے مختلف اسباب میں سے ایک بنیادی غلطی خود مسلمانوں کی ہے، مسلمانوں نے اپنی افادیت اور نافعیت کو نہ صرف ختم کردیا بلکہ وہ یہاں کی مشرک وبت پرست قوموں میں پوری طرح گھل مل گئے اور اپنے ملی تشخص اور مذہبی امتیازات کو ہی فراموش کردیا، مسلم اور غیر مسلم میں ظاہری طور پر کوئی فرق باقی نہ بچا، زندگی کے سارے شعبوں سے اسلام کی روح فوت ہوتی چلی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل ایمان اور اہل شرک کے مابین اخلاقی ومعاشرتی سارے امتیازات ختم ہوگئے، بالآخر مسلمان اس قدر کمزور ہوئے کہ ان کی حیثیت سیاسی مہروں سے زیادہ نہ بچی، جنھیں سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے مفادات میں بھرپور استعمال کیا۔

موجودہ صارتحال میں خوش آئند پہلو یہ ہے کہ ملک کی اکثریت اب بھی سیکولر بنیادوں پر یقین رکھتی ہے، وہ ملک کی سالمیت اور اس کی گنگا جمنی تہذیب کی بقا کے لیے فکر مند بھی ہے، ایسے حالات میں مسلمانوں کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی افادیت کو ثابت کریں، اسلام کی حقانیت اور اس کی اعلیٰ تعلیمات سے غیروں کو متعارف کرائیں، آپسی میل جول، تجارت ومعالات، سفر وحضر، مختلف تقریبات وحادثات بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایسا عملی نمونہ پیش کریں کہ نفرت کی دیوارایں خود بخود ڈھ جائیں اور مذہب کے نام پر جو خلیج قائم کی جارہی ہے وہ ختم ہوجائے۔ اور اس کے لیے کسی بھی تحریک، جماعت یا تنظیم سے وابستگی کی کوئی شرط نہیں، ہر فرد اپنی اپنی سطح پر اس کا آغاز کرے، وہ خود کو ایک نفع بخش اور فائدہ مند مسلمان ثابت کرے، پھر وہ خود ہی اس کے بہترین نتائج کا مشاہدہ کرے گا۔ یہی طریقہ ہے اس ملک میں مسلمانوں کے ملی تشخص اور مذہبی امتیازات کے ساتھ باقی رہنے کا، اس کے علاوہ اگر کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا گیا جس کی بنیاد جذباتیت پر یا سیاسی دعووں پر ہوگی تو شاید حالات کی تبدیلی مزید قربانیوں کا مطالبہ کرے۔ والقدر عنداللہ۔

فرشتوں کا نزول

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

"ایک روایت میں ہے کہ ملک الموت نمازوں کے اوقات میں آدمیوں کی جستجو کرتے ہیں، اگر کسی شخص کو نماز کے اوقات کا اہتمام رکھنے والا پاتے ہیں، تو مرتے وقت اسے کلمہ طیبہ خود ہی سکھا دیتے ہیں اور شیطان کو اس کے پاس سے ہٹا دیتے ہیں۔"

اللہ اللہ! کیا شان کریمی ہے! وہی وقت نزع واحتضار تو انسان کی زندگی کا نازک ترین اور اہم ترین وقت ہوتا ہے۔ یوں کہیے کہ ساری عمر کی ریاضتوں اور مجاہدوں کا حاصل اور نچوڑ ۔۔۔۔ وہی گھڑی تو اس کی ہوتی ہے کہ کیا عامی اور کیا عالم ہر بشر کو اپنی بے بسی، اپنی محتاجی کا مشاہدہ عینی ہوتا ہے۔

روحِ انسانی ایک ایک کا منہ حسرت وتمنا کے ساتھ تکتی ہوتی ہے کہ اب کیا ہوگا؟ عین اس گھڑی نمازی مسلمان کے لیے نصرت الٰہی اور امداد غیبی فرشتے کی شکل میں نزول کرتی ہے اور فرشتے بجائے امتحان لینے کے اور جانچ کرنے کے خود ہی پرچہ کا حل تلقین کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا بھی سخی ممتحن آپ کی نظر میں دنیا میں گزرا ہے کہ نام تو امتحان کا لے اور خود ہی سوال کا جواب زبان سے فر فر سنائے دیتا ہے۔ قید صرف نمازی مسلمان کی لگی ہوئی ۔۔۔۔ وہی نماز جو فرض کل چوبیس گھنٹوں میں پچاس بار بھی نہیں، بیس بار نہیں، صرف پانچ وقت ہے اور فرض نماز کی تعداد سو نہیں، پچاس نہیں، کل سترہ ہے۔ جنت کا سفر اس سے آسان تر اور جنت کا ٹکٹ اس سے ارزاں اور کیا ہوگا۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ان اللہ یدنی المؤمن فیضع علیه کنفه ویستره، فیقول: أتعرف ذنب کذا، أتعرف ذنب کذا، فیقول؛ نعم یا رب! حتی قرره بذنوبه کلها ورأی فی نفسه أنه قد هلك، قال؛ سترتها علیك فی الدنیا وأنا أغفرها لك الیوم، فیعطی کتاب حسناته.

"حضرت ابن عمر صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ (حساب کے وقت) مومن کو اپنے قریب کر کے اس پر دامن رحمت رکھ کر اس سے دریافت کرے گا کہ تجھ کو اپنا فلاں اور فلاں گناہ یاد ہے اور وہ کہتا جائے گا کہ ہاں اے پروردگار! یہاں تک کہ (اس کے سارے) گناہوں کا اقرار اس سے کرا لیا جائے گا اور وہ اپنے دل میں کہنے لگے گا کہ بس اب میں ہلاک ہوا تو اس وقت ارشاد باری ہوگا کہ میں نے تو دنیا میں ان گناہوں کی پردہ پوشی کر رکھی تھی اور آج بھی انہیں معاف ہی کیے دیتا ہوں، اس کے بعد اس کی نیکیوں کا نامہ اعمال اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔"

اللہ اللہ! اس گھڑی کی بے حد و نہایت مسرت یا آج کی اردو میں بے پناہ خوشی کا کوئی اندازہ بھی کر سکتا ہے؟ پھانسی کے تختہ پر چڑھ کر صحیح وسلامت اتر آنے سے بھی یہ مسرت کیا ہوگی جو عین عذاب آخرت کے کنارے پر پہنچ کر پھر بچ جانے والے مومن کی ہوگی! الفاظ میں ظاہر کرنا نہ تو اس وقت ممکن ہے اور نہ اس وقت بھی کسی کو شاید قدرت ہو سکے۔ مایوس سے مایوس گناہ گار اور حسرت ویاس سے لب ریز خطاوار کے دل کی ڈھارس، البتہ شاید آج اس مژدۂ جاں فزا سے کچھ بندھ سکے۔

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Postal Reg. No.
RBL/NP-55/2017 - 19

Volume: 11 | SEPTEMBER 2019 | Issue: 09

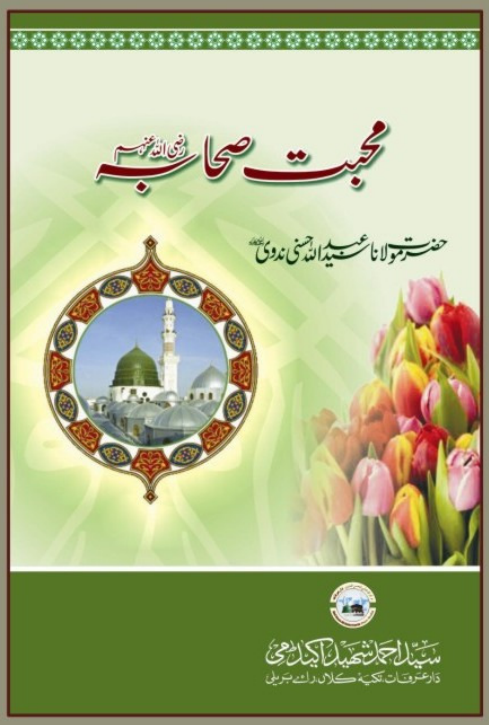

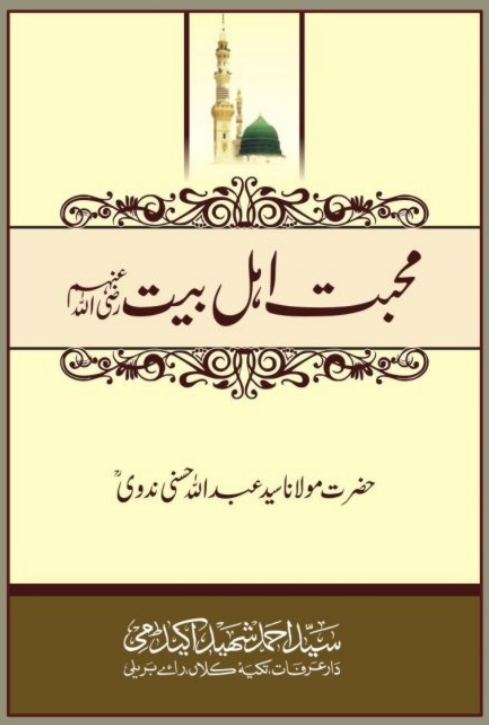

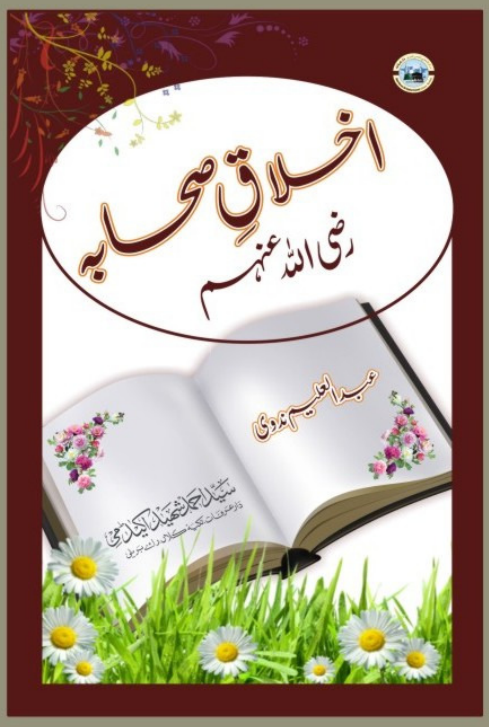

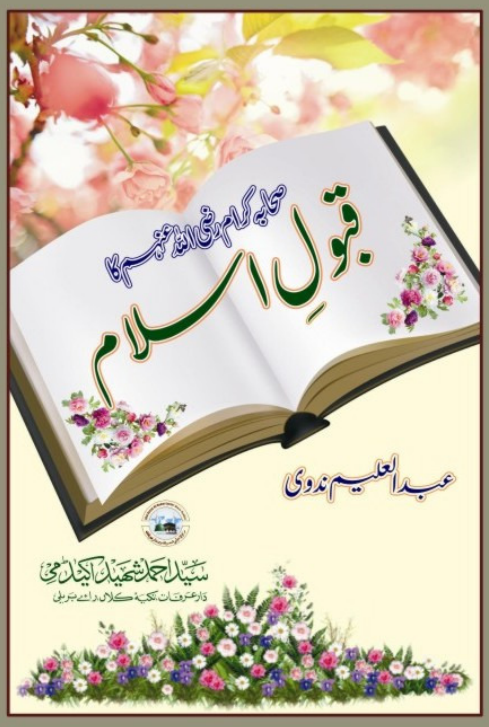

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)